مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

B.A. URDU SEMESTER - IV C. NO. : UR - 401

کلاس: بی۔اے، سمسٹر (چہارم)

مضمون : اُردو

کورس نمبر: UR-401

اکائی: 1-31

کورس کوآرڈی نیٹر

ڈاکٹر حِنا ایس آبرول

(c) جُملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اِس کتاب کا کوئی حِصّہ کسی شکل میں جموّں یونیورسٹی کی تحریری اِجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

مضمون نگار:

۱۔ ڈاکٹر لیاقت جعفری

صدر شعبہ اردو۔ایم۔اے۔ایم کالج، جموں

ایڈیٹنگ: ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ

مزید معلومات کے لئے دیکھیں https://www.distanceeducationju.in

SYLLABUS OF B.A Urdu (Non-CBCS)

Examination: to be held May 2018,2019 and 2020 onwards

Course code:UR-401
Title: Study of Masnavi & Inshaiya
Duration: 3 hrs.
Max.Marks:100

Internal Assesement:	20
External Exam :	80
Credit :	4

OBJECTIVES:

The Course proposes to provide comprehensive knowledge of beginning and development of Masnavi & Inshaiya in Urdu Language. An effort shall be made to enable the students to read

the Masnavis prescribed so that they are in a position to appreciate both the Genres fully.

Unit-I Detailed study of the following Masnavis :16 marks

۱. مثنوی سحرالبیان (تلخیص) از میر حسن ۲. مثنوی گلزارِنسیم (تلخیص) از دیا شنکر نسیم

۳. مثنوی میرے گھر کا حال از میر تقی میر

Unit II: Critical Questions on the following :16marks

i) Critical appreciation of the Masnavis prescribed for Unit-I.

ii) Life and works of the poets prescribed for Unit-I.

III) Definition of Masnavi and characteristics of the Masnavis prescribed.

iv) The art of the poets prescribed in the light of the syllabus for unit I.

v) Summary of the Masnavis prescribed for unit-I.

Unit-III: For Textual reading :16 Marks

۱. کاہلی، از سر سید احمد خان ۲. سیر زندگی، محمد حسین آزاد ۳. برج بانو، کنہیالال کپور

۴. ہاسٹل میں پڑھنا، پطرس ۵. گواہ، رشید احمد صدیقی

Unit -IV: Critical Question تنقیدی سوالات:

i. Definition and characteristics of Inshaiya.

ii. Critical appreciation of the Inshaiyas prescribed for unit-II.

iii. Characteristics of the Inshaiyas writing of the authors prescribed with special reference to the course prescribed.

iv. Summary of the Inshaiyas prescribed (One at a time).

v. Life and works of the aurhors prescribed for Unit-III.

UNIT-V : This unit contains two parts.

PART-I : One un-seen passage shall be given and the students shall be asked two questions given at the end of the passage and all the candidates will be required to attempt both questions. Each question shall carry four marks.

PART-II : Objective type questions will be based on the syllabus prescribed for Unit I to IV. Each part shall carry one marks. In this Unit eight questions with three possible options (one correct) shall be asked. Each part of this Unit shall carry eight marks.

NOTE FOR PAPER SETTING :

This paper shall be divided into five units. The question paper shall have two questions each in Unit I to IV. The candidate shall be

required to attempt one question from each Unit (I to IV). Questions from Unit Ist and IIIrd shall be based on explanation with reference to context with 100% choice of the course prescribed for these Units. Unit-V contains two parts. Part-I is un-seen passage and Part-II is based on eight objective type questions. In part-1 two quwstions will be asked from the un-seen passage given at the end and the candidates will be required to attempt both questions. Each question shall carry four marks. In Part-II of this Unit, eight questions with three possible options (one correct) shall be set. In this Unit each part shall be of one marks.

BOOKS PRESCRIBED :-

۱۔ مثنوی سحرالبیان میرحسن مرتب رشید حسن خان، مکتبہ جامعہ نئی دھلی

۲۔ مثنوی گلزار نسیم دیاشنکر نسیم ایضا

۳۔ مثنوی گھر کا حال میر تقی میرؔ کلیات میر

۴۔ پطرس کے مضامین پطرس بخاری

Books Recommended :

۱. مختصر تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر اعجاز حسین

۲. تاریخ ادب اردو از نورالحسن نقوی

۳۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، از محمود الٰہی

ل ۴۔ اردو مرثیہ کا ارتقاء از مسیح الزما

فہرست:

اکائی1 میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان''	3
اکائی2 دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم''	19
اِکائی3 میر تقی میر کی مثنوی ''میرے گھر کا حال''	39
اِکائی4 میر حسن کے حالات زندگی	58
اِکائی5 میر تقی میر کے حالات زندگی	61
اِکائی6 مثنوی کی تعریف اور خصوصیات	66
اِکائی7 مثنوی سحر البیان کا تنقیدی جائزہ	70
اکائی8 مثنوی گلزار نسیم کا تنقیدی جائزہ	76
اکائی9 مثنوی میرے گھر کا حال کا تنقیدی جائزہ	91
اِکائی10 میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کا خلاصہ	94
اکائی11 گلزار نسیم کا خلاصہ	98
اکائی12 سر سید کا انشائیہ کاہلی	104
اکائی13 محمد حسن کا انشائیہ سیر زندگی	111
اکائی14 کنہیا لال کپور کا انشائیہ برج بانو	121
اکائی15 پطرس بخاری کا انشائیہ ہاسٹل میں پڑھنا	130
اکائی16 رشید احمد صدیقی کا انشائیہ گواہ	147
اکائی17 انشائیہ کاہلی کا تنقیدی جائزہ	157
اکائی18 انشائیہ برج بانو کا تنقیدی جائزہ	160
اکائی19 انشائیہ ہاسٹل میں پڑھنے کا تنقیدی جائزہ	163

اکائی20 انشائیہ کی تعریف اور خصوصیات	166
اکائی21 سرسید احمد خان کی انشائیہ نگاری	171
اکائی22 محمد حسن کی انشائیہ نگاری	176
اکائی23 کنہیالال کپور کی انشائیہ نگاری	177
اکائی24 پطرس بخاری کی انشائیہ نگاری	179
اکائی25 رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری	182
اکائی26 انشائیہ کاہلی کا خلاصہ	185
اکائی27 انشائیہ برج بانو کا خلاصہ	187
اکائی28 انشائیہ ہاسٹل میں پڑھنا کا خلاصہ	189
اکائی29 سلیس بحوالہ سیاق وسباق	193
اکائی30 درسی اقتباسات	195
اکائی31 معروضی سوالات	207

اکائی۔1 ---------- میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان''

ساخت

1.1 مثنوی ''سحر البیان'' کا تعارف
1.2 مثنوی ''سحر البیان'' کے اشعار
1.3 مثنوی ''سحر البیان'' کی فرہنگ
1.4 مثنوی ''سحر البیان'' کی تشریح
1.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات
1.6 امدادی کتب

1.1 مثنوی ''سحر البیان'' کا تعارف

مثنوی ''سحر البیان'' میر حسنؔ کا شاہکار ہے۔ جو مقبولیت اِس مثنوی کو دُنیائے ادب میں حاصل ہوئی ہے کسی اور مثنوی کو حاصل نہیں ہو سکی۔ یہ مثنوی میر حسنؔ نے ۱۱۹۹ھ م ۱۷۸۴ء میں لکھی تھی۔ یہ ایک مختصر طبعزاد مثنوی ہے۔ مثنوی کی ایک مقبولِ عام بحر متقارب مثمن محذوف الآخر یعنی فعولن فعولن فعولن فعول میں لکھی گئی ہے۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے لیکن اپنے دامن میں سماج اور تہذیب کے ایسے نقوش رکھتی ہے جو اُس وقت کی زندگی کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔ شہزادے اور شہزادی کی عیش پسندی، وزیروں اور وزیر زادوں کی خدمت گزاری، ایثار و قربانی، دولت مند معاشرے کی دِلچسپیاں، رہن سہن، طور طریق کی دِل کش تصویریں اِس مثنوی میں ملتی ہیں۔

1.2 مثنوی ''سحرالبیان'' کے اشعار

کِسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ / تھا وہ شہنشاہِ گیتی پناہ
کِسی طرف سے وہ، نہ رکھتا تھا غم / مگر، ایک اولاد کا تھا اَلَم
اِسی بات کا، اُس کے تھا دِل پہ داغ / نہ رکھتا تھا، وہ اپنے گھر کا چراغ
وزیروں کو ، اِک روز اُس نے بُلا / جو کُچھ دِل کا احوال تھا، سو کہا
کہ میں کیا کروں گا؟ یہ مال و منال / فقیری کا، ہے میرے دِل کو خیال
فقیراب نہ ہؤں، تو کروں کیا علاج؟ / نہ پیدا ہُوا، وارثِ تخت و تاج
وزیروں نے کی عرض، کہ اے آفتاب / نہ ہو، تُجھ کو ذرّہ کبھی اضطراب
عجب کیا؟ کہ ہووے تُمھارا خلف / کرو تُم نہ اوقات اپنی، تلف
نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو / کہ قُرآں میں آیا ہے ''لَا تَقْنَطُوا''
بُلاتے ہیں ہم، اہلِ تنجیم کو / نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو
نجوٗمی و رمّال اور برہمن / غرض، یاد تھا جن کو اس ڈھب کا فن
بُلا کر انھیں ، شہ کنے لے گئے / ہُوں ہی رؤ بہ رؤ شہ کے، وے سب گئے
پڑا جب نظر، وہ شہِ تاج و تخت / دُعا دی، کہ ہوں شہ کے بیدار بخت
جماعت نے رمّال کی، عرض کی / کہ ہےَ گھر میں، اُمیّد کی کُچھ خوشی
ہےَ اِس بات پر اجتماع تمام / کہ طالع میں فرزند ہےَ تیرے نام
نجوٗمی بھی کہنے لگے در جواب / کہ ہم نے بھی، دیکھی ہےَ اپنی کتاب
سِتارے نے، طالع کے بدلے ہیں طَور / خُوشی کا، کوئی دِن میں آتا ہے دوَر
کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار / تو، کُچھ اُنگلیوں پر کِیا پھر شُمار

جنم پترا شاہ کا دیکھ کر
تُلا اور برچھک پہ کرکر، نظر

کہا! رام جی کی ہے تُم پر دَیا
چندرماں سا بالک ترے ہووے گا

کُچھ ایسا نِکلتا ہے پوتھی میں اب
خرابی ہو اُس پر کِسی کے سبب

یہ لڑکا تو ہوگا، مگر کیا کہیں
خطر ہےَ اُسے بارھویں برس میں

نہ آوے، یہ خُورشید بالائے بام
بلندی سے خطرہ ہے اُس کو تمام

نہ نکلے ، یہ بارہ برس رشکِ مہ
رہے بُرج میں، یہ مہِ چار دہ

کہا سُن کے شہ نے، یہ اُن کے تئیں
کہو! جی کا خطرہ تو اس کو نہیں؟

کہا جان کی سب طرح خیر ہے
مگر، دشتِ غُربت کی کُچھ سیَر ہے

کوئی اِس پہ عاشق ہو جن و پری
کوئی اِس کی معشوق ہو اِستری

ہوئی کُچھ خوشی شہ کو، اور کُچھ اَلم
کہ دُنیا میں، تو اُم ہیَں شادی و غم

کہا شہ نے، اِس پر نہیں اعتبار
جو چاہے، کرے میرا پروردگار

خُدا پر، زبس اُس کو تھا اعتقاد
لگا مانگنے، حق سے اپنی مُراد

خُدا سے لگا کرنے وہ اِلتجا
لگا آپ مسجد میں رکھنے دِیا

نِکالا مُرادوں کا آخر سُراغ
لگائی اُدھر لَو، تو پایا چراغ

گئے نو مہینے، جب اِس پر ، گُزر
ہُوا گھر میں شہ کے تولدِ پسر

عجب صاحبِ حُسن پیدا ہوا
جسے مہرو مہَ دیکھ شیدا ہُوا

ہُوا وہ ، جو اِس شکل سے دِل پذیر
رکھا نام اُس کا، شہِ بے نظیر

نئے سر سے، عالم کو عشرت ہوئی
کہ لڑکے کے ہونے کی نوبت ہوئی

محل سے لگا، تابہ دیوانِ عام
عجب طرح کا ہُوا اِزدحام

چلے لے کے نذریں ، وزیر و امیر
لگے کھینچنے زر کے تودے فقیر

دِیے شاہ نے شاہ زادے کے نانو
مشائخ کو اَور پیر زادوں کو گانو

امیروں کو جاگیر، لشکر کے زر
وزیروں کو الماس و لعل و گہر

خواصوں کو، خوجوں کو جوڑے دیے
پیادے جو تھے، اُن کو گھوڑے دِیے

خوشی سے کیا یاں تلک زر نِثار
جسے ایک دینا تھا، بخشے ہزار

چھٹی تک، غرض تھی خوشی ہی کی بات
کہ دِن عِید تھی رات تھی شب برات

بڑھے ابر ہی ابر میں جوں ہلال
محل میں، لگا پلنے وہ نو نہال

پلا جب وہ اِس ناز و نعمت کے ساتھ
پدر اَور مادر کی شفقت کے ساتھ

ہُوئی اُس کے مکتب کی شادی عیاں
ہُوا پھر اُنھیں شادِیوں کا سماں

مُعلّم، اتالیق، مُنشی، ادیب
ہر اِک فن کو اُستاد، بیٹھے قریب

کیا قاعدے سے شرُوع کلام
پڑھانے لگے عِلم اُس کو تمام

دِیا تھا زبس حق نے ذہنِ رسا
کئی برس میں عِلم سب پڑھ چکا

گیا نام پر اپنے وہ دِل پذیر
ہر اک فن میں سچ مچ ہُوا بے نظیر

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی
کھلی، گُل جھڑی غم کے جنجال کی

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
کہ بیٹا! نہا دھو کے تیار ہو

نہا دھو کے نِکلا وہ گُل اِس طرح
کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض شاہ زادے کو نہلا دُھلا
دِیا خلعتِ خُسروانہ پنہا

جواہر سراسر پنھایا اُسے
جواہر کا دریا بنایا اُسے

غرض ہو کے اِس طرح آراستہ
خراماں ہُوا سرِوِ نَو خاستہ

نِکل گھر سے، جس دم ہُوا وہ سوار
کیے خوان، گوہر کے، اُس پر نِثار

زبس تھا سواری کا باہر ہجوم
ہُوا جب کہ ڈنکا، پڑی سب میں دھوم

غرض، اِس طرح سے سواری چلی
کہے تو، کہ بادِ بہاری چلی

رعیّت کی کثرت، ہجومِ سپاہ
گُزرتی تھی رُک رُک کے ہر جا نِگاہ

ہُوئے جمع کوٹھوں پہ جو مردو زن
ہر اِک سطح تھا جوں زمینِ چمن

نظر جِس کو آیا وہ ماہِ تمام
کیا اُس نے جھک جھک کے اُس کو سلام

غرض، شہر سے باہر اِک سمت کو
کوئی باغ تھا شہ کا، اُس میں سے ہو

گھڑی چار تک خُوب سی سیر کر
رعیّت کو دِکھلا کے اپنا پسر

اِسی کثرتِ فوج سے ہو سوار
پھرا شہر کی طرف وہ شہر یار

سواری کو پہنچا گئی فوج اُدھر
گئے اپنی منزل میں شمس و قمر

پہر رات تک پہنے پوشاک وہ
رہا ساتھ سب کے طرب ناک وہ

قضارا، وہ شب تھی شب چار دہ
پڑا جلوہ لیتا تھا، ہر طرف مہ

نظارے سے تھا اُس کے دِل کو سرُور
عجب عالمِ نُور کا تھا ظہُور

عجب لُطف تھا سیرِ مہتاب کا
کہے تو، کہ دریا تھا سیماب کا

ہُوا شاہ زادے کا دل بے قرار
یہ دیکھی جو واں چاندنی کی بہار

کُچھ آئی جو اُس شہ کے جی میں ترنگ
کہا! آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ

خواصوں نے جا شاہ سے عرض کی
کہ شہزادے کی آج یوں ہے خُوشی

ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا
کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا

کہا شہ نے، اب تو گئے دِن نِکل
اگر یوں ہے مرضی، تو کیا ہے خلل؟

پر اِتنا ہو، اُس سے خبردار ہوں
دِنھوں کی ہے چوکی، وہ بیدار ہوں

قضارا، وہ دِن تھا اُسی سال کا
غلط وہم، ماضی میں تھا حال کا

سُخن مولوی کا، یہ سچ ہے قدیم
کہ آگے قضا کے، ہو احمق حکیم

1.3 مثنوی ''سحرالبیان'' کی فرہنگ

	الفاظ	معنی
	الفاظ	معنی
1۔	گیت گیتی پناہ	دُنیا کو پناہ دینے والا، رنج، غم، دکھ
2۔	الم	مرض، درد، دکھ
3۔	آفات	سورج، حسین معشوق، بلند مرتبہ، کامل
4۔	اضطراب	پریشانی، تکلیف
5۔	خلف	بیٹا، بیٹی، اولاد، فرض شناس، فرماں بردار
6۔	تلف	خرچ، ضائع
7۔	یاس	نا اُمید، محروم
8۔	اہلِ تنجیم	قسمت دیکھنے والا، نصیب جاننے والا
9۔	بیدار بخت	نصیب کا جاگنا
10۔	اجماع	سب کا متفق ہونا
11۔	طالع	نصیب، قسمت، مقدر
12۔	تلا	ٹیکا
13۔	بالک	بچہ
14۔	تولد	پیدا ہونا
15۔	پسر	بیٹا، بچہ
16۔	بے نظیر	بے مثال، لاجواب
17۔	ازدحام	بھیڑ، مجمع، ہجوم

18۔	پوتھی	گانٹھ
19۔	بالائے بام	محل کی چھت
20۔	دشت	جنگل
21۔	استری	عورت
22۔	اعتقاد	بھروسہ، اعتماد
23۔	الماس	ہیرا، سفید ہلکے رنگ کا پتھر
24۔	لعل	موتی
25۔	نثار	قربان
26۔	ابر	بادل
27۔	پدر	باپ، والد
28۔	مدر	ماں، والدہ
29۔	شفقت	محبت، پیار
30۔	معلم	عالم، پڑھانے والا، علم دینے والا، استاد، مدرس
31۔	اتالیق	تربیت دینے والا، معلم
32۔	خلعت	لباس، پوشاک، عمدہ اور قیمتی کپڑے
33۔	خراماں	آہستہ آہستہ ناز والی چال
34۔	سپاہ	فوج، سپاہی
35۔	شمس وقمر	سورج اور چاند
36۔	سیماب	پارہ، چنگاری
37۔	احمق	بیوقوف

1.4 مثنوی ''سحرالبیان'' کی تشریح

اشعار:

کِسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
تھا وہ شہنشاہِ گیتی پناہ

کِسی طرف سے وہ، نہ رکھتا تھا غم
مگر، ایک اولاد کا تھا اَلَم

اِسی بات کا، اُس کے تھا دِل پہ داغ
نہ رکھتا تھا، وہ اپنے گھر کا چراغ

وزیروں کو ، اِک روز اُس نے بُلا
جو کُچھ دِل کا احوال تھا، سو کہا

کہ میں کیا کروں گا؟ یہ مال ومنال
فقیری کا، ہے میرے دِل کو خیال

فقیراب نہ ہوؤں،تو کروں کیاعِلاج؟
نہ پیدا ہُوا، وارثِ تخت و تاج

وزیروں نے کی عرض، کہ اے آفتاب
نہ ہو، تُجھ کو ذرّہ کبھی اضطراب

عجب کیا؟ کہ ہووے تُمھارا خلف
کرو تُم نہ اوقات اپنی، تلف

نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو
کہ قُرآں میں آیا ہے ''لَا تَقنَطوُا''

بُلاتے ہیں ہم، اہلِ تنجیم کو
نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو

نجوّمی و رمّال اور برہمن
غرض، یاد تھا جن کو اس ڈھب کا فن

بُلا کر اُنھیں ، شہ کنے لے گئے
جُوں ہی رؤ بہ رؤ شہ کے، وے سب گئے

تشریح:

کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا جو بڑا طاقت ور تھا اور ساری دُنیا اُس کی پناہ میں تھی۔ وہ دولت مند تھا مگر اُس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ سو اِس بات کا اُسے بہت رنج تھا۔ ایک دِن اُس نے اپنے وزیروں کو بُلایا اور اپنے دِل کا حال اُن پر

ظاہر کیا۔ کہا کہ یہ تاج وتخت اور دولت میرے کِس کام کی کہ میرا کوئی وارث ہی نہیں ہے۔ اِس لیے مجھے سوائے فقیر ہوجانے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ وزیروں نے عرض کی کہ بادشاہ سلامت آپ ہرگز ملال نہ رکھیں۔ کیوں کہ عجب نہیں جو آپ کے گھر لڑکا پیدا ہو۔ اِس لیے آپ اپنی زندگی اور تخت وتاج کو ضائع نہ کریں۔ نا اُمیدی کی گفتگو نہ کریں۔ کیوں کہ قرآنِ پاک میں لِکھا ہے کہ نا اُمید ہونا گناہ ہے۔ ہاں یہ جو اولاد کا غم ہے۔ سو اس کا حل بھی ہم کرتے ہیں۔ ہم نجومیوں کو لاتے ہیں جو آپ کی قسمت دیکھیں گے۔ پس نجومی، جوتشی اور براہمن گویا جن جن کو بھی اس فن کا علم تھا، سب کو بُلایا گیا اور اُنھیں بادشاہ کے رُوبرو پیش کیا گیا۔

اشعار:

پڑا جب نظر، وہ شہِ تاج و تخت — دُعا دی، کہ ہوں شہ کے بیدار بخت
جماعت نے رمّال کی، عرض کی — کہ ہے گھر میں، اُمید کی کُچھ خوشی
ہے اِس بات پر اجتماعِ تمام — کہ طالع میں فرزند ہے تیرے نام
نجُومی بھی کہنے لگے در جواب — کہ ہم نے بھی، دیکھی ہے اپنی کتاب
سِتارے نے، طالع کے بدلے ہیں طَور — خُوشی کا، کوئی دِن میں آتا ہے دوَر
کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار — تو، کُچھ اُنگلیوں پر کِیا پھر شُمار
جنم پترا شاہ کا دیکھ کر — ٹکلا اور برچھک پہ کرکر، نظر
کہا! رام جی کی ہے تُم پر دَیا — چندرماں سا بالک ترے ہووے گا
کُچھ ایسا نِکلتا ہے پوتھی میں اب — خرابی ہو اُس پر کِسی کے سبب
یہ لڑکا تو ہوگا، مگر کیا کہیں — خطر ہے اُسے بارھویں برس میں

کنہ آوے، یہ خُورشید بالائے بام — بلندی سے خطرہ ہے اُس کو تمام
نہ نکلے ، یہ بارہ برس رشکِ مہ — رہے بُرج میں، یہ مہِ چار دہ

تشریح:

نجومیوں اور جیوتشیوں نے جب بادشاہ کو دیکھا تو جھُک کر سلام کرنے کے بعد اُسے دُعا دی کہ اُس کی قسمت کا ستارہ بلند ہو۔ جیوتشیوں کی جماعت نے عرض کیا کہ بادشاہ کے گھر اولاد ہونا لکھا ہے۔ سب نجومیوں اور جیوتشیوں نے کہا کہ اُنھوں نے اپنی اپنی کتابیں دیکھ کر یہ نتیجا اخذ کیا ہے کہ بادشاہ کی قسمت کا ستارہ طلوع ہونے والا ہے اور اُس کے ہاں وارث ہوگا۔ پنڈتوں نے بھی اندازہ لگایا۔ اُنگلیوں پر کچھ شُمار کیا اور بادشاہ کی جنم کنڈلی دیکھ کر ٹلا اور بر چھک پر غور کر کے کہا کہ بھگوان کی تم پر مہربانی ہے۔ تمہارے گھر چاند سا لڑکا ہوگا۔ پنڈتوں نے مزید کہا کہ تھوڑی سی خرابی کے آثار بھی نکلتے ہیں۔ یعنی لڑکا تو ضرور ہوگا اور نہایت حسین ہوگا۔ مگر اُس کا بارہواں سال خطرے والا ہے۔ شہزادہ اُونچے مقام یعنی بالا خانہ یا چھت پر نہ چڑھے۔ کیوں کہ اُسے اُونچی جگہ ہی سے خطرہ ہے۔ اس لڑکے کو بارہ برس برج میں رہنا ہوگا۔

اشعار:

کہا سُن کے شہ نے، یہ اُن کے تئیں — کہو! جی کا خطرہ تو اِس کو نہیں؟
کہا جان کی سب طرح خیر ہے — مگر، وحشتِ غُربت کی کُچھ سیَر ہے
کوئی اس پہ عاشق ہو جن و پری — کوئی اس کی معشوق ہو استری
ہوئی کُچھ خوشی شہ کو، اور کُچھ اَلم — کہ دُنیا میں، تو اَم ہیَں شادی و غم
کہا شہ نے، اِس پر نہیں اِعتبار — جو چاہے، کرے میرا پروردگار
خُدا پر، زبس اُس کو تھا اعتقاد — لگا مانگنے، حق سے اپنی مُراد
خُدا سے لگا کرنے وہ اِلتجا — لگا آپ مسجد میں رکھنے دِیا

تشریح:

بادشاہ نے پنڈتوں کی باتیں سُن کر پریشانی سے پوچھا کہ شہزادے کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پنڈتوں نے عرض کیا کہ شہزادے کی زندگی کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے مگر اُس کے مقدر میں پردیس کی سیر کرنا ضرور لکھا ہے۔ کوئی پری یا جن اُس پر عاشق ہوگی اور شہزادہ کسی عورت کی محبت میں گرفتار ہو جائے گا۔ بادشاہ کو اس بات پر خوشی بھی ہوئی اور غم بھی ہوا۔ خوشی اِس لیے کہ شہزادے کی زندگی کو خطرہ نہیں ہے اور غم اِس بات کا کہ مقدر میں پردیس کی خاک چھاننا لکھا ہے۔ لیکن دُنیا میں خوشی اور غمی جڑواں ہیں۔ یعنی دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اِس لیے بادشاہ نے کہا کہ جو خدا کو منظور ہوگا وہ ہوگا۔ اُسے خدا پر بھروسہ تھا اور وہ خدا سے دِن رات اپنی مُراد پوری ہونے کی دُعائیں مانگنے لگا۔

اشعار:

نِکالا مُرادوں کا آخر سُراغ
لگائی اُدھر لَو، تو پایا چراغ

گئے نو مہینے، جب اس پر، گُزر
ہُوا گھر میں شہ کے تولدِ پسر

عجب صاحِبِ حُسن پیدا ہوا
جسے مہرو مہ دیکھ شیدا ہُوا

ہُوا وہ، جو اِس شکل سے دِل پذیر
رکھا نام اُس کا، شہِ بے نظیر

نئے سر سے، عالم کو عشرت ہوئی
کہ لڑکے کے ہونے کی نوبت ہوئی

محل سے لگا، تابہِ دیوانِ عام
عجب طرح کا ہُوا اِزدحام

چلے لے کے نذریں، وزیر و امیر
لگے کھینچنے زر کے تودے فقیر

دِیے شاہ نے شاہ زادے کے نانو
مشائخ کو اَور پیر زادوں کو گانو

امیروں کو جاگیر، لشکر کے زر
وزیروں کو الماس و لعل و گہر

خواصوں کو، خوجوں کو جوڑے دیے
پیادے جو تھے، اُن کو گھوڑے دِیے

خوشی سے کیا یاں تلک زر نثار
جسے ایک دینا تھا، بخشے ہزار

چھٹی تک، غرض تھی خوشی ہی کی بات
کہ دِن عیدتھی رات تھی شب برات

تشریح:

آخر بادشاہ کی مُراد پوری ہوگئی اور نو مہینے اُس پیشن گوئی کے گزرنے کے بعد اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا نہایت حسین تھا۔ اِتنا حسین کہ چاند سورج بھی اُس پر رشک کرنے لگیں۔ شہزادے کی خوب صورتی اور شکل اِتنی بھلی لگنے والی تھی کہ اُس کا نام شہزادہ بے نظیر رکھا گیا۔ ساری رعایا کو شہزادے کے پیدا ہونے پر خوشی ہوئی۔ محل سے دیوان عام تک لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ وزیر و امیر بادشاہ کو مبارک باد دینے کے لیے نذریں گزارنے لگے۔ بادشاہ نے خزانے کے مُنہ کھول دیے اور فقیروں کو بے انتہا دولت خیرات میں دے دی۔ امیروں کو جاگیریں دیں۔ وزیروں کو ہیرے جواہرات دیے۔ باندیوں اور خوجوں کو عُمدہ لباس اور فوج کے پیادوں کو گھوڑے بخش دیے۔ بادشاہ کو اس قدر خوشی تھی کہ جس کو ایک دینا تھا اُسے ہزار دیے۔ اِس طرح شہزادے کی چھٹی کے دِن تک ایسی خوشی منائی جاتی رہی۔

اشعار:

بڑھے ابر ہی ابر میں جوں ہلال
محل میں، لگا پلنے وہ نو نہال

پلا جب وہ اِس ناز و نعمت کے ساتھ
پدر اَور مادر کی شفقت کے ساتھ

ہُوئی اُس کے مکتب کی شادی عیاں
ہُوا پھر اُنھیں شادیوں کا سماں

مُعلّم، اتالیق، مُنشی، ادیب
ہر اِک فن کو اُستاد، بیٹھے قریب

کیا قاعدے سے شرُوع کلام
پڑھانے لگے عِلم اُس کو تمام

دِیا تھا زبس حق نے ذہنِ رسا
کئی برس میں عِلم سب پڑھ چکا

گیا نام پر اپنے وہ دِل پذیر
ہر اک فن میں سچ مچ ہُوا بے نظیر

تشریح:

جیسے بادلوں میں چاند بڑھتا ہے، شہزادہ محلوں میں پلنے لگا۔ اُسے ماں باپ کی شفقت اور تمام نازونعمت حاصل تھے۔ پھر اُسے مدرسے میں بٹھایا گیا اور اس موقعے پر بھی بہت خوشیاں منائی گئیں۔ ہر فن کے اُستاد مقرر کیے گئے۔ جنھوں نے بڑے سلیقے سے اُسے ہر قسم کے علم میں ماہر کیا۔ چوں کہ شہزادہ بہت ذہین تھا اس لیے وہ بہت کم عرصے میں وہ سب علم پڑھ گیا اور اپنے نام ہی کی طرح وہ ہر فن میں بے نظیر ہو گیا۔

اشعار:

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی
کھلی ،گُل جھڑی غم کے جنجال کی

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
کہ بیٹا! نہا دھو کے تیار ہو

نہا دھو کے نکلا وہ گُل اس طرح
کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض شاہ زادے کو نہلا دُھلا
دِیا خِلعتِ خُسروانہ پنھا

جواہر سراسر پنھایا اُسے
جواہر کا دریا بنایا اُسے

غرض ہو کے اِس طرح آراستہ
خِراماں ہُوا سَروِ نَو خاستہ

نِکل گھر سے، جِس دم ہُوا وہ سوار
کیے خوان، گوہر کے، اُس پر نِثار

زبس تھا سواری کا باہر ہجُوم
ہُوا جب کہ ڈنکا، پڑی سب میں دھوم

غرض، اِس طرح سے سواری چلی
کہے تُو، کہ بادِ بہاری چلی

رعیّت کی کثرت، ہجُوم سِپاہ
گُزرتی تھی رُک رُک کے ہر جا نِگاہ

ہُوئے جمع کوٹھوں پہ جو مردو زن
ہر اِک سطح تھا جُوں زمینِ چمن

نظر جس کو آیا وہ ماہِ تمام
کِیا اُس نے جھک جھک کے اُس کو سلام

تشریح:

جب شہزادہ بارہ برس کا ہوا تو بادشاہ نے اُس سے کہا کہ نہا دھو کر تیار ہو۔ اور جب نازک اندام شہزادہ نہا دھو کر یوں سامنے آیا جیسے بدلی سے چاند نکلتا ہے۔ تو بادشاہ نے شاہانہ لباس پہنایا۔ ہیرے جواہرات سے اُسے آراستہ کیا۔ اِس طرح وہ سج سنور کر لمبے قد والا خوب صورت شہزادہ گھر سے نکل گھوڑے پر سوار ہوا۔ بادشاہ نے ہیرے جواہرات کے تھال اُس پر نچھاور کیے اور غریبوں میں تقسیم کیے۔ جب سواری کے چلنے کی نوبت آئی تو ہر طرف جدھر بھی نظر جاتی تھی لوگوں کی بھیڑ اور فوج نظر آتی تھی۔ عورت اور مرد کوٹھوں پر شہزادے کو دیکھنے کے لیے جمع تھے۔ جس جس کو وہ نظر آیا اُس نے جھک کر سلام کیا۔

اشعار:

غرض، شہر سے باہر اِک سمت کو — کوئی باغ تھا شہ کا، اس میں سے ہو
گھڑی چار تک خوب سی سیر کر — رعیت کو دکھلا کے اپنا پسر
اسی کثرتِ فوج سے ہو سوار — پھرا شہر کی طرف وہ شہر یار
سواری کو پہنچا گئی فوج اُدھر — گئے اپنی منزل میں شمس و قمر
پہر رات تک پہنے پوشاک وہ — رہا ساتھ سب کے طرب ناک وہ

تشریح:

شہر کے باہر ایک طرف باغ تھا۔ اُس میں کچھ وقت تک بادشاہ اور شہزادے نے خوب سیر کی۔ اپنی رعایا کو اپنا بیٹا دکھلا کر اپنی فوج کے ساتھ بادشاہ شہر کی طرف واپس آیا۔ بادشاہ کی سواری کو محل میں پہنچا کر فوج واپس چلی گئی اور ساتھ ہی رات پڑ گئی۔

اشعار:

قضارا، وہ شب تھی شبِ چار دہ | پڑا جلوہ لیتا تھا ، ہر طرف مہ
نظارے سے تھا اُس کے دِل کو سُرُور | عجب عالمِ نُور کا تھا ظہُور
عجب لُطف تھا سیرِ مہتاب کا | کہے تو، کہ دریا تھا سیماب کا
ہُوا شاہ زادے کا دل بے قرار | یہ دیکھی جو واں چاندنی کی بہار
گُچھ آئی جو اُس شہ کے جی میں ترنگ | کہا! آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ
خواصوں نے جا شاہ سے عرض کی | کہ شہزادے کی آج یوں ہے خُوشی
اِرادہ ہےَ کوٹھے پہ آرام کا | کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا
کہا شہ نے ، اب تو گئے دِن نِکل | اگر یوں ہے مرضی، تو کیا ہے خلل؟
پر اِتنا ہو، اُس سے خبردار ہوُں | جھوں کی ہے چوکی، وہ بیدار ہوُں
قضارا، وہ دِن تھا اُسی سال کا | غلط وہم، ماضی میں تھا حال کا
سُخن مولوی کا، یہ سچ ہے قدیم | کہ آگے قضا کے ، ہو احمق حکیم

تشریح:

ایک پہر رات گزرنے تک شہزادہ سب کے ساتھ رہا۔ اِتفاق سے وہ چودھویں کی رات تھی اور ہر طرف جلوہ ہی جلوہ تھا۔ اِس چاند کی روشنی کے خوب صورت نظارے سے شہزادے کا دِل بہت خوش تھا۔ چاند کی چاندنی بڑا لطف دے رہی تھی۔ شہزادے کا دِل اِس نورانی رات کی بہار کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہوا تھا اور اس کے دِل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ آج چھت پر سویا جائے۔ کنیزوں نے جا کر بادشاہ سے عرض کی کہ شہزادہ آج چھت پر سونا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے سوچا کہ اب بارہ برس تو گزر چکے ہیں لہذا کوئی خطرہ تو ہے نہیں۔ سو اگر شہزادے کی یہ مرضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

مگر پہرے داروں کو سخت ہدایت کردی کہ وہ ہوشیار رہیں۔ اتفاق سے وہ دِن بارھویں سال کا آخری دِن تھا، جس سے متعلق پنڈتوں نے پیش گوئی کی تھی کہ کوئی پری اُس پر عاشق ہوسکتی ہے۔ مگر موت کے آگے کسی حکیم کا بھی بس نہیں چلتا۔ سچی کہاوت ہے۔

1.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر ۱: اشعار کی تشریح معہ حوالہ کیجئے۔

سوال نمبر ۲: مثنوی سحر البیان کا مصنف کون ہے؟ تعارف پیش کیجئے۔

سوال نمبر ۳: مثنوی سحر البیان کے پہلے ۱۰۰ اشعار کا خلاصہ بیان کیجئے

سوال نمبر ۴: مثنوی سحر البیان کے تمہیدیہ اشعار کا خلاصہ لکھئے۔

1.6 امدادی کتب

1۔ مثنوی سحر البیان، از میر حسن، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو۔

2۔ اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی ۱۱ سی، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

3۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

اکائی۔2 ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم''

ساخت

2.1 مثنوی ''گلزار نسیم'' کا تعارف

2.2 مثنوی ''گلزار نسیم'' کے اشعار

2.3 مثنوی ''گلزار نسیم'' کی فرہنگ

2.4 مثنوی ''گلزار نسیم'' کی تشریح

2.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

2.6 امدادی کتب

2.1 مثنوی ''گلزار نسیم'' کا تعارف

مثنوی ''گلزارِ نسیم''، لکھنؤ کے دورِ عروج و شائستہ کی ایسی یادگار ہے جو اپنے انداز کی واحد ہے۔ آج تک اِس مثنوی کا جواب ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ آج تک اِس پایے کا کوئی دوسرا فن پارہ وجود میں نہیں آ سکا ہے۔ اِس کا ہر شعر کوئی نہ کوئی صنعت لیے ہوئے ہے۔ ایسی مرصع سازی کی ہے کہ عقل اپنی انگلیوں کو دانتوں تلے داب کے رہ جاتی ہے اور اس قسم کی مرصع سازی شعریت کی بلی چڑھا کر ہی کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ پنڈت دیا شنکر نسیم کا کمال ہے کہ محض ۳۲ سال کی عمر میں اُنھوں نے یہ بے مثال کارنامہ انجام دیا۔ اس کے ہر شعر میں کوئی

نہ کوئی صنعت ہی نہیں شعریت بھی انتہا درجے کی ہے۔

مثنوی ''گلزارِنسیم'' ایک عشقیہ داستان ہے جو''گل بکاولی'' کے نام سے مشہور ہے۔نسیم نے قِصہ خود نہیں بنایا بلکہ نثر میں موجود ایک داستان کو نظم کا جامہ پہنا دیا ہے۔اصل قِصہ تو فارسی نثر میں عزت اللہ بنگالی کا لکھا ہوا ہے۔ گلکرسٹ کی فرمائش پر نہال چند لاہوری نے ۱۸۰۳ء میں اس قصے کو اُردو میں ترجمہ کیا اور ''مذہبِ عشق'' نام رکھا۔نسیم کا ماخذ یہی ہے۔ اسی قصے کو ریحان الدین ریحان لکھنوی نے ۱۷۹۶ء میں نظم بھی کیا تھا۔اُن کی مثنوی لگ بھگ نو ہزار اشعار پر مُشتمل ہے۔ریحان نے اسے ''خیابان'' یا ''گلگشتِ منظوم'' کا نام دیا۔ بظاہر نسیم نے اس مثنوی کو نہیں دیکھا لیکن ''خیاباں'' اور گلزار میں جو مناسبت ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ نسیم کو یہ نام ''خیاباں'' کو دیکھ کر ہی سُوجھا ہوگا۔ پھر ''خیاباں'' اور ''گلزارِنسیم'' کی بحر بھی ایک ہی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں میں کوئی مناسبت ومشابہت نہیں۔نسیم کی مثنوی ''خیاباں'' کا تقریباً چھٹا حصہ ہے۔گویا طولِ بے جا کے برعکس نسیم نے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے اور اسی لیے اُن کی مثنوی کے حسن و برجستگی کا راز یہی ہے۔''مذہبِ عشق'' اگرچہ نثر ہے تاہم اس میں موقعے موقعے سے اشعار بھی کہے گئے ہیں، جن میں کوئی شاعرانہ حسن ہے نہ خوبی۔ قصّے میں بھی نسیم نے کم وبیش اور پس وپیش کیا ہے۔ کرداروں کو بھی نوک پلک سے سنوارا ہے۔''مذہبِ عشق'' اور ''گلزارِنسیم'' میں ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ نثری قصے کو خواہ مخواہ تمثیل و تصوف کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔اکثر مقامات پر خالص عشقیہ واقعات کی تاویل وتوجیہہ پیش کر کے قصے کے لطف کو بھی غارت کر دیا ہے۔اب یہ معلوم نہیں کہ یہ کارنامہ عزت اللہ بنگالی کا ہے یا نہال چند لاہوری کا۔گویا یہ محض ترجمہ نہیں ہے بلکہ شاعر نے اِس میں تخلیقی شان بھی پیدا کر دی ہے۔

۳۹۔۱۸۳۸ء میں جب دیا شنکر نسیم نے اِس قصّے کو نظم کا جامہ پہنایا تو ''سحرالبیان'' کی سحرالبیانی کے چرچے جا بجا تھے۔''گلزارِنسیم'' نے بھی پہلی ہی فرصت میں اہلِ علم و ادب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔اب ''سحر البیان'' کے ساتھ ساتھ ''گلزارِنسیم'' کے بھی چرچے ہونے لگے۔ جس شہرت کی بلندی پر ''سحرالبیان'' براجمان تھی، وہیں ''گلزارِنسیم'' کو بھی جگہ ملی۔

2.2 مثنوی ”گلزارِ نسیم“ کے اشعار

پُورب میں ایک تھا شہنشاہ
سُلطان زَین اُلملوک ذی جاہ

خالق نے دِیے تھے چار فرزَند
دانا، عاقل، ذکی، خِرد مند

نقشا ایک اَور نے جمایا
پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا

اُمید کے نخل نے دِیا بار
خُورشید حمل میں ہُوا نمُودار

خُوش ہوتے ہی طِفلِ مہ جبیں سے
ثابت یہ ہُوا سِتارہ بِیں سے

پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اِس کو
پھر دیکھ نہ سکیے گا کِسی کو

جب نامِ خُدا جَواں ہُوا وہ
مانندِ نظر رَواں ہُوا وہ

آتا تھا شِکار گاہ سے شاہ
نظّارہ کِیا پدر نے ناگاہ

صاد آنکھوں کو دیکھ کر پسر کی
بینائی کے چہرے پر نظر کی

وی آنکھ جو شہ نے رونمائی
چشمک نہ بھائیوں کو بھائی

ہر چند کہ بادشاہ نے ٹالا
اُس ماہ کو شہر سے نِکالا

گھر گھر یہی ذِکر تھا، یہی شور
خارِج ہُوا نُورِ دیدۂ کور

آیا کوئی لے کے نُسخۂ نُور
لایا کوئی جا کے سُرمۂ طوُر

تقدیر سے چل سکا نہ کُچھ زور
بینا نہ ہُوا وہ دیدۂ کور

تھا ایک کحّالِ پیرِ دیریں
عیسٰی کی تھیں اُس نے آنکھیں دیکھیں

وہ مردِ خُدا بہت کراہا
سُلطاں سے مِلا، کہا کہ شاہا!

ہے باغِ بکاولی میں اِک گُل
پلکوں سے اُسی پہ مار چنگل

اُس نے تو گُلِ اِرم بتایا
لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا

شہ زادے ہُوئے وہ چاروں تیار
رُخصت کیے شہ نے چار ناچار

وہ بادیہ گردِ خانہ برباد
یعنی تاج الملوک ناشاد

مَیدان میں خاک اُڑا رہا تھا
دیکھا، تو وہ لشکر آ رہا تھا

پُوچھا: تُم لوگ خیل کے خیل
جاتے ہو کِدھر کو صورتِ سَیل؟

بولا لشکر کا اِک سپاہی
جاتی ہے اِرَم کو فوجِ شاہی

سلطان زین المُلوک شہ زور
دیدارِ پسر سے ہوگیا کور

منظور، عِلاجِ رَوشنی ہے
مطلوب، گُلِ بکاوَلی ہے

گُل کی جو خبر سُنائی اُس کو
گُلشن کی ہَوا سمائی اُس کو

ہمرہ کِسی لشکری کے ہو کر
قِسمت پہ چلا یہ نیک اختر

وارِد ہُوئے اِک جگہ سرِ شام
فِردوس تھا اُس مقام کا نام

دِلبر نام ایک بیسوا تھی
اُس ماہ کی واں محل سرا تھی

دروازے سے فاصلے پہ گھر تھا
نقّارہ چوب دارِ دَر تھا

آواز پہ وہ لگی ہُوئی تھی
آپ آن کے ٹھاٹھ دیکھتی تھی

جِس شخص کو مال دار پاتی
باہر سے اُسے لگا کے لاتی

دِھلا کے جُوئے کا ذِکر اُٹھا کر
چَوسر میں وہ لوٹتی سراسَر

جیت اُس کی تھی، ہاتھ جو کُچھ آتا
اُس کا کوئی ہتھکنڈا نہ پاتا

بِلّی کا سر، چراغ واں تھا
چُوہا پاسے کا پاسباں تھا

اُلٹاتے اَڑی پہ قسمت آسا
بلّی جو دِیا ، تو مؤش پاسا
جیتے ہوئے بندے تھے ہزاروں
قسمت نے پھنسائے یہ بھی چاروں
وہ ریگِ رَواں کا گردِ لشکر
یعنی تاج الملوک اَبتر
اُٹھا، کہ خبر تو لیجیے چل کر
گُزرا دَر باغ بیسوا پر
حیران تھا یہ بلند پایہ
نِکلی اندر سے ایک دایہ
لڑکا کوئی کھو گیا تھا اُس کا
ہم شکل یہ مہ لقا تھا اُس کا
بیٹا وہ سمجھ کے جی سے اُس کو
گھر لائی ہنسی خُوشی سے اُس کو
چلتے تھے اُدھر سے دو جُواری
ایک، ایک کی کررہا تھا خواری
کہتے تھے: فریب دو گے کیا تُم!
شہہ زادے نہ ہم ، نہ بیسوا تُم
ذِکر، اپنے برادروں کا سُن کر
بولا وہ عزیز: سُن تو مادر!
کون اَیسی کھلاڑ بیسوا ہے؟
شہہ زادوں کو جس نے زِچ کیا ہے
بولی وہ کہ ہاں، جُوا ہے بدکام
دَلبر،اک بیسوا ہے خُود کام
بلّی پہ چراغ رکھ کے شب کو
چوسَر میں وہ لوٹتی ہے سب کو
پاسے کی ہے کَل چراغ کے ساتھ
وہ بلّی کے سر، یہ چوہے کے ہاتھ
سوچا وہ کہ اب تو ہم ہیں آگاہ
جیتے ہیں، تو جیت لیں گے ناگاہ
چوسر کے سیکھنے کو یکسَر
گھوما وہ بہ رنگِ نرد گھر گھر
اُس گُل کے جو ہاتھ میں زر آیا
جاں بازی کو سوئے دِلبر آیا
مِلتی تھی کھلاڑ ڈنکے کی چوٹ
نقارہ و چوب میں چلی چوٹ
آواز وہ سُن کے در پر آئی
ہمرہ اُسے لے کے اندر آئی
کام اُس کا تھا بس کہ کھیل کھانا
چوسر کا جما وہ کارخانہ

پاسے سے چلی نہ جعل سازی
اُجڑی وہ بسا بسا کے بازی

سب ہار کے نقدو جنس ہارے
جیتے ہوئے بندے بد کے ہارے

بُنیاد جو کُچھ تھی، جب گنوائی
تب خود وہ کِھلاڑ مُہرے آئی

بولی بہ ہزار عجز و زاری
تُم جیتے میاں! مَیں تُم سے ہاری

بولا وہ کہ سُن، یہ ہتھکنڈے چھوڑ
نقارۂ در کو چوب سے توڑ

یہ مال، یہ زر، یہ جیتے بندے
یوُں ہی یہیں رکھ یہ جنس چندے

بالفِعل اِرَم کو جاتے ہَیں ہم
اِنشاَ ءَ اللہ! آتے ہَیں ہم

بولی وہ، سُنوتو بندہ پرور!
گُلزارِ اِرم ہے پریوں کا گھر

انسان و پری کا سامنا کیا
مُٹھی میں ہَوا کا تھامنا کیا!

شہ زادہ ہنسا، کہا کہ دِلبر!
کُچھ بات نہیں، جو رکھیے دِل پر

وہ دامنِ دشتِ شوق کا خار
یعنی، تاجُ المُلوکِ دِل زار

اِک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد
صحراے عدم بھی تھا جہاں گرد

سائے کو پتہ نہ تھا شجر کا
عنقا تھا نام جانور کا

ڈانڈا تھااِرم کے بادشاہ کا
اِک دیو تھا پاسباں بلا کا

دانت اُس کے تھے گورکن قضا کے
دو نتھنے رہِ عدم کے ناکے

سر پر پایا بلا کو اُس نے
تسلیم کیا قضا کو اُس نے

بھوُکا کئی دِن کا تھا وہ ناپاک
فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک

بولا کہ چکھوں گا مَیں یہ اِنساں
اللہ اللہ شُکرِ اِحساں

شہ زادہ کہ مُنھ میں تھا اجل کے
اندیشہ سے رہ گیا دہل کے

پل مارنے کی ہُوئی جو دیری
سُبحان اللہ! شان تیری

اُشتر کئی جاتے تھے اُدھر سے
پُر آرد و رَوغن و شکر سے

وہ دیو لپک کے مار لایا
غُراتے ہُوئے شِکار لایا

مَیدا بھی، شکر بھی گھی بھی پایا
خاطِر میں یہ اُس بشر کے آیا

میٹھا اِس دیو کو کھِلاؤ
گُڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو؟

حلوے کی پکا کے اِک کڑھائی
شیرینی دیو کو چڑھائی

ہر چند کہ تھا وہ دیو کڑوا
حلوے سے کِیا مُنھ اُس کا میٹھا

کہنے لگا: کیا مزا ہے دِل خواہ
اے آدمی زاد! واہ وا

چیز اچھی کھِلائی تو نے مُجھ کو
کیا اُس کے عوض میں دوُں میں تُجھ کو

بولا وہ، کہ پہلے قول دیجے
پھر جو مَیں کہوں قبول کیجے

وہ ہاتھ پر اُس کے مار کے ہاتھ
بولا، کہ ہے قول جان کے ساتھ

بولا وہ،کہ قول اگر یہی ہے
بد عہدی کی پر نہیں سہی ہے

گُل زارِ اِرم کی ہے مُجھے دُھن
بولا کہ ارے بشر وہ گُلبُن!

خورشید کے ہم نظر نہیں ہے
اندیشے کا واں گُزر نہیں ہے

ہوتا نہ جو قول کا سہارا
بچتا نہ یہیں تو، خیر ہارا

رہ جا، مرا بھائی ایک ہے اور
شاید کُچھ اُس سے بن پڑے طوَر

اِک ٹیکرے پر گیا، بُلایا
وہ مِثلِ صدائے کوہ آیا

حال اُس سے کہا، کہ قول ہارا
ہے پیر یہ نوجواں ہمارا

مُشتاق اِرَم کی سیَر کا ہے
کوشش کرو، کام خیَر کا ہے

حمالہ نام دیونی ایک
چھوٹی بہن اُس کی تھی بڑی نیک

خط اُس کو لِکھا بہ ایں عِبارت
اے خواہرِ مہرباں !سلامت

2.3 مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کی فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
جاہ	رُتبے والا	خردمند	عقل مند
ذکی	ذہین	نخل	درخت
بار	پھل	ستارہ بین	نجومی
نبرد	چوسر کا مہرہ	پاسبان	محافظ
کھلاڑ	بازاری عورت	عجز درازی	منت سماجت
ڈانڈا	سرحد	بالفصل	فی الحال
رونمائی	منہ دِکھائی	چشمک	رنجش
شگوفہ	مذاق	نوردیدہ	آنکھوں کی روشنی
موش	چوہا	ریگِ رواں	اُڑنے والی ریت
بتر	بدحال	بےخود	بغیر کھانے کے
خرمن	ڈھیر	سوختہ تن	جس کا دِل جلا ہوا ہو
حیلہ	بہانہ	کشاں کشاں	آہستہ آہستہ
اژدہا	بڑا سانپ	سلاسل	زنجیر
ہالا	ہار	رخت	لباس
قمری	فاختہ،ایک پرندہ	یکسر	بیابر
مہرے	آگے	ہتھکنڈے	داؤ پیچ
دشت	جنگل	عنقا	ایک نایاب پرندہ

جہاں گرد	مسافر	اُشتر	اونٹ
کحال	آنکھوں کا علاج کرنے والا	چُنگل	پنجہ
گُلِ ارم	جنت کا پھول	بادیہ گرد	جنگل میں پھرنے والا
خیل کے خیل	گروہ کے گروہ	زچ کرنا	تنگ کرنا
گل	طریقہ	آرد	آٹا
روغن	گھی	لوتھ	لاش
ناکے	راستے	بدایں	اس
نقب	چوری کرنے والا	انگستری	انگوٹھی
جل	دھوکہ	کف	ہاتھ
گریا	رونا	مہجور	جُدا ہونا
اکشبتار	بھوک	دِل گیر	غمگین
دل افگار	زخمی دِل	بال وپر	فساد
شر	فتنہ	شعلہ آتشیں	غضب ناک
دُشمنِ چشم	آنکھ کا دُشمن	متصل	نزدیک
اِفتاد	مصیبت	تعجیل	جلدی سے
سہادے	شیطان	داغی	غلام
شیرینی	میٹھا	گُل سمن	باغ
ہوا ہوا	غائب ہونا	گُل چیں	پھول توڑنے والا
آبِ رفتہ	پانی جو بہہ گیا ہو	کنڈھ	غفلت
مجہول	پاگل	مُفت بر	مُفت خور

جو	نہر	برصد امتیاز	بڑی عزت کے ساتھ
عازم	ارادہ کرنے والا	وجت رز	انگور کی بیٹی
خستم	ناراضگی	مستور	پوشیدہ
روے پنہاں	چھپا ہوا چہرا	خاتم	انگوٹھی
نوحہ خواں	ماتم کرنے والا	درو خواب	سونا
روی	بُری	فصد	نشتر لگانا
ماہ سپہر	آسمان کی طرح	طراف	گھومنا

2.4 مثنوی ''گلزارنسیم'' کی تشریح

اشعار:

پُورب میں ایک تھا شہنشاہ سُلطان زَین اُلملوک ذی جاہ
خالق نے دِیے تھے چار فرزَند دانا، عاقل، ذکی، خِرد مند
نقشا ایک اَور نے جمایا پَس ماندہ کا پیش خیمہ آیا
اُمید کے نخل نے دِیا بار خُورشید حمل میں ہُوا نمُودار
خُوش ہوتے ہی طِفلِ مہ جبیں سے ثابت یہ ہُوا سِتارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اِس کو پھر دیکھ نہ سکیے گا کِسی کو
جب نامِ خُدا جَواں ہُوا وہ مانندِ نظر رَواں ہُوا وہ
آتا تھا شِکار گاہ سے شاہ نظّارہ کِیا پدر نے ناگاہ

صاد آنکھوں کو دیکھ کر پسر کی　　　بینائی کے چہرے پر نظر کی
دی آنکھ جو شہ نے رونمائی　　　چشمک نہ بھائیوں کو بھائی

تشریح:

پورب میں ایک شہنشاہ تھا جس کا نام زین الملوک تھا۔ خُدا نے اُسے چار بیٹے دیے تھے جو بڑے ذہین اور عقل مند تھے۔ شہنشاہ کے ہاں ایک اور بچّے کے پیدا ہونے کے آثار نمودار ہوئے۔ بچّہ پیدا ہوا اور اُس کے پیدا ہوتے ہی نجومیوں نے کہا کہ اس پیارے لڑکے کو دیکھتے ہی اُس کا شہنشاہ باپ اندھا ہو جائے گا۔ خدا کے فضل سے جب لڑکا جوان ہوا اور نظر کی مانند اِدھر اُدھر پھرنے لگا کہ ایک دِن بادشاہ شکار گاہ سے واپس آ رہا تھا تو اچانک لڑکے سے اُس کا سامنا ہوا اور لڑکے کی آنکھوں میں دیکھتے ہی بادشاہ اندھا ہو گیا۔

اشعار:

ہر چند کہ بادشاہ نے ٹالا　　　اُس ماہ کو شہر سے نِکالا
گھر گھر یہی ذِکر تھا، یہی شور　　　خارِج ہُوا نوُرِ دیدۂ کور
آیا کوئی لے کے نُسخۂ نوُر　　　لایا کوئی جا کے سُرمۂ طوُر
تقدیر سے چل سکا نہ کُچھ زور　　　بِینا نہ ہُوا وہ دیدۂ کور
تھا ایک کحّالِ پیرِ دیرین　　　عیسیٰ کی تھیں اُس نے آنکھیں دیکھیں
وہ مردِ خُدا بہت کراہا　　　سُلطاں سے مِلا، کہا کہ شاہا!
ہے باغِ بکاولی میں اِک گل　　　پلکوں سے اُسی پہ مار چنگل
اُس نے تو گُلِ ارم بتایا　　　لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا

تشریح:

بادشاہ نے اپنے بیٹے کی مُنہ دِکھائی میں اپنی آنکھوں کی روشنی دے دی۔ دوسرے بھائیوں کو رنجش کے سبب یہ بات اچھی نہیں لگی۔ بادشاہ نے اس بات کو ٹالنے کی اگرچہ کوشش کی مگر اُنھوں نے اِس خوب صورت لڑکے کو شہر سے نکال دیا۔ شہر کے ہر گھر میں یہی چرچا تھا کہ بادشاہ اپنے لڑکے کو دیکھنے سے اندھا ہو گیا۔ کئی لوگ بادشاہ کی آنکھوں کا علاج کرنے کے لیے آئے اور اُنھوں نے بادشاہ کی بینائی واپس لانے کے لیے بہت کوشش کی لیکن بادشاہ کی بینائی واپس نہیں آئی۔ وہیں ایک بوڑھا آنکھوں کا علاج کرنے والا تھا جس نے حضرتِ عیسیٰ کی آنکھیں دیکھی تھیں، گویا بہت بزرگ تھا۔ وہ اللہ کا بندہ بہت دُکھی ہوا۔ اُس نے بادشاہ سے مِل کر کہا کہ بکاولی کے باغ میں ایک پھول ہے۔ اگر وہ ایک پھول مِل جائے اور اُس کی پتیاں آنکھوں پر ملی جائیں تو آنکھوں کی روشنی واپس آسکتی ہے۔ کحال نے محض گُلِ ارم کا ذکر کیا تھا۔ مگر لوگوں کے لیے یہ ایک انوکھی اور مذاق کی بات بن گئی۔

اشعار:

شہ زادے ہُوئے وہ چاروں تیار — رُخصت کِیے شہ نے چار ناچار
وہ بادِیہ گَرد خانہ برباد — یعنی تاج الملوک ناشاد
مَیدان میں خاک اُڑا رہا تھا — دیکھا، تو وہ لشکر آ رہا تھا
پُوچھا: تُم لوگ خَیل کے خَیل — جاتے ہو کِدھر کو صوٗرتِ سَیل؟
بولا لشکر کا اک سِپاہی — جاتی ہے ارَم کو فوجِ شاہی
سلطان زین اُلملوک شہ زور — دیدارِ پسر سے ہوگیا کور
منظوٗر، عِلاجِ رَوشنی ہے — مطلوٗب، گُلِ بکاوَلی ہے
گُل کی جو خبر سُنائی اُس کو — گُلشن کی ہَوا سمائی اُس کو
ہمرہ کِسی لشکری کے ہو کر — قِسمت پہ چلا یہ نیک اختر

تشریح:

چاروں شہزادے اُس پھول کو تلاشنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بادشاہ نے مجبوراً معہ لشکر و اسباب کے اُن سب کو رُخصت کیا۔ تاج الملوک جو جنگلوں کی خاک چھان رہا تھا، بہت غمگین تھا۔ اُس نے لشکر کو دُھول اُڑاتے دیکھا تو اُس نے ایک سپاہی سے پوچھا کہ تم گروہ کے گروہ طوفان کی طرح کِدھر جا رہے ہو۔ اُس نے جواب دیا کہ شاہی فوج اِرم جا رہی ہے کیوں کہ بادشاہ زین الملوک اپنے بیٹے کو مُنہ دیکھ کر کور ہو گیا ہے۔ اُسی کے علاج کے لیے گُل بکاولی مطلوب ہے۔ تاج الملوک نے جو پھول کی بات سُنی تو اُس کے دِل میں بھی بکاولی کے باغ تک پہنچنے کی دُھن سمائی اور وہ نیک اختر اپنی قِسمت پر بھروسہ کر کے کسی سپاہی کے ہمراہ ہو گیا۔

اشعار:

وارِد ہُوئے اِک جگہ سرِ شام — فِردوس تھا اُس مقام کا نام

دِلبر نام ایک بیسوا تھی — اُس ماہ کی واں محل سرا تھی

دروازے سے فاصلے پہ گھر تھا — نقارہ چوب دارِ دَر تھا

آواز پہ وہ لگی ہُوئی تھی — آپ آن کے ٹھاٹھ دیکھتی تھی

جِس شخص کو مال دار پاتی — باہر سے اُسے لگا کے لاتی

دِکھلا کے جُوئے کا ذِکر اُٹھا کر — چَوسر میں وہ لوٹتی سَراسَر

تشریح:

ایک شام یہ فوج فردوس نام کے ایک شہر میں داخل ہوئی۔ وہاں دلبر نام کی بیسوا رہتی تھی۔ شہر کے کچھ فاصلے پر پہ اُس بیسوا کا محل تھا۔ دروزے پر ایک چوب دار کھڑا رہتا تھا اور خود وہ ہر وقت استاک میں رہتی کہ کوئی دولت مند آدمی آئے۔ جب کوئی دولت مند آدمی اُسے نظر پڑتا، وہ اُسے گھر کے اندر بُلاتی۔ باتوں باتوں میں اُس سے جوئے کا ذکر کرتی اور پھر چوسر کھیلتے کھیلتے اُس شخص کو لوٹ لیتی تھی۔

اشعار:

جیت اُس کی تھی، ہاتھ جو کُچھ آتا اُس کا کوئی ہتھکنڈا نہ پاتا
بلّی کا سر، چراغ واں تھا چؤہا پاسے کا پاسباں تھا
اُلٹاتے اڑی پہ قسمت آسا بلّی جو دِیا، تو مؤش پاسا
جیتے ہوئے بندے تھے ہزاروں قِسمت نے پھنسائے یہ بھی چاروں
وہ ریگِ رَواں کا گردِ لشکر یعنی تاج الملوکِ اَبتر
اُٹھا، کہ خبر تو لیجیے چل کر گزرا درِ باغ بیسوا پر
حیران تھا یہ بلند پایہ نِکلی اندر سے ایک دایہ
لڑکا کوئی کھو گیا تھا اُس کا ہم شکل یہ مہ لقا تھا اُس کا
بیٹا وہ سمجھ کے جی سے اُس کو گھر لائی ہنسی خُوشی سے اُس کو

تشریح:

جُوا کھیلتے جیت ہمیشہ اُسی کی ہوتی تھی کیوں کہ اُس کے فریب اور چالاکی کو کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ اُس نے چراغ بلّی کے سر پر رکھا ہوا ہوتا تھا اور چُوہا اُس کے پاس بیٹھا پاسے کی نگرانی کرتا تھا۔ جب وہ مکار عورت ہارنے لگتی تو چوہا اور بلّی مِل کر بساط کو اُلٹ دیتے تھے۔ اس طرح ہزاروں لوگوں کو جوئے میں ہرا کر اُس نے قید کیا ہوا تھا۔ قِسمت نے ان چاروں شہزادوں کو کہ جو بادشاہ (والد) کے لیے بکاولی کا پھول لینے نکلے تھے، اُس کے جال میں پھنسا دیا۔ جب وہ دیر تک واپس نہ آئے تو شہزادہ تاج الملوک، جو ریگِ رواں کی مانند بُرے حال میں تھا نے سوچا کہ جا کر بھائیوں کی خبر کرنی چاہیئے۔ تب وہ بیسوا کے باغ کے اندر داخل ہوا۔ شہزادہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اتنے میں ایک نوکرانی اندر سے نِکلی۔ اُس نوکرانی کا لڑکا گُم ہو گیا تھا جس کی شکل تاج الملوک سے مِلتی جُلتی تھی۔ اُس نے شہزادے کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھا اور خوشی خوشی اُسے اپنے گھر لے آئی۔

اشعار:

چلتے تھے اُدھر سے دو جُواری	ایک، ایک کی کررہا تھا خواری
کہتے تھے: فریب دو گے کیا تُم!	شہہ زادے نہ ہم ، نہ بیسوا تُم
ذِکر، اپنے برادروں کا سُن کر	بولا وہ عزیز :سُن تو مادر!
کون ایسی کھلاڑ بیسوا ہے؟	شہہ زادوں کو جس نے زِچ کیا ہے
بولی وہ کہ ہاں، جُوا ہے بدکام	دِلبر،اِک بیسوا ہے خُود کام
بلّی پہ چراغ رکھ کے شب کو	چوسر میں وہ لوٹتی ہے سب کو
پاسے کی ہے کل چراغ کے ساتھ	وہ بلّی کے سر، یہ چوہے کے ہاتھ
سوچا وہ کہ اب تو ہم ہیں آگاہ	جیتے ہیں، تو جیت لیں گے ناگاہ

تشریح:

راستے میں وہ جارہے تھے کہ اُس طرف سے دو جواری جارہے تھے جو ایک دُوسرے کی رُسوائی ور بےعزتی کررہے تھے اور جھگڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تُم مجھے کیا دھوکہ دو گے، نہ تم بیسوا ہو اور نہ میں شہزادہ۔ شہزادوں کا ذکر سُن کر تاج الملوک نے نوکرانی سے پوچھا کہ وہ کون سی عورت ہے جو مردوں کے ساتھ جوا کھیلتی ہے اور جس نے شہزادوں کو تنگ کیا ہے۔ نوکرانی بولی کہ ہاں دِلبر نامی ایک بیسوا ہے جو بُرے کام کرتی ہے۔ وہ رات کو بلّی کے سر پر چراغ رکھ کر چوہے کو پاس بٹھا لیتی ہے۔ وہ دونوں ایک دُوسرے سے کسی نہ کسی طرح سے جُڑے ہوئے ہیں۔ شہزادے نے سوچا کہ اب ہم اِس راز سے پوری طرح واقف ہو ہی گئے ہیں۔ اگر زندہ رہے تو ایک دِن اُس بیسوا سے جُوا کھیل کر جیت جائیں گے۔

اشعار:

چوسر کے سیکھنے کو یکسر — گھوما وہ بہ رنگِ نرد گھر گھر
اُس گُل کے جو ہاتھ میں زر آیا — جاں بازی کو سوئے دِلبر آیا
مِلتی تھی کھِلاڑ ڈنکے کی چوٹ — نقارہ و چوب میں چلی چوٹ
آواز وہ سُن کے در پر آئی — ہمرہ اُسے لے کے اندر آئی
کام اُس کا تھا بس کہ کھیل کھانا — چوسر کا جما وہ کارخانہ
پاسے سے چلی نہ جعل سازی — اُجڑی وہ بسا بسا کے بازی
سب ہار کے نقد و جنس ہارے — جیتے ہوئے بندے بَد کے ہارے
بُنیاد جو کُچھ تھی، جب گنوائی — تب خود وہ کھِلاڑ مُہرے آئی
بولی بہ ہزار عجز و زاری — تُم جیتے میاں! میَں تُم سے ہاری

تشریح:

اب شہزادہ تاج الملوک چوسر کا کھیل کھیلنے کے لیے شطرنج کے مہرے کی طرح گھر گھر پھرنے لگا۔ اُس کے پاس جو کچھ تھا، لے کر وہ دلبر کے ساتھ جُوا کھیلنے کے لیے آیا، نقارہ بجایا۔ وہ بازاری عورت کھُلم کھُلا ہر کسی سے ملتی تھی۔ آواز سُن کر باہر آئی اور تاج الملوک کو لے کر اندر گئی۔ وہ ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنے کی خواہش مند تھی۔ پس چوسر کی بازی شروع ہوگئی۔ لیکن اب کے اُس کی چال نہ چلی اور وہ سب کچھ دولت، غلام اور خود کو بھی ہار گئی اور انکساری سے اُس نے تاج الملوک کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا اور اُس پر عاشق ہوگئی۔

اشعار:

بولا وہ کہ سُن، یہ ہتھکنڈے چھوڑ
نقارۂ در کو چوب سے توڑ
یہ مال، یہ زر، یہ چہیتے بندے
یوں ہی یہیں رکھ بہ جنس چندے
بالفعل اِرَم کو جاتے ہیں ہم
اِنشاء اللہ! آتے ہیں ہم
بولی وہ، سُنو تو بندہ پرور!
گلزارِ اِرم ہے پریوں کا گھر
انسان و پری کا سامنا کیا
مُٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا!
شہ زادہ ہنسا، کہا کہ دِلبر!
کچھ بات نہیں، جو رکھیے دِل پر

تشریح:

بیسوا کی باتیں سُن کر تاج الملوک نے کہا کہ یہ فریب اب بند کردے اور جو نقارہ اس مقصد کے لیے لگایا ہوا ہے، اُسے توڑ دے۔ یہ میرا جیتا ہوا مال اور یہ بندے بھی یہیں رکھ، امانت کے طور پر۔ میں کسی کام سے ارم کو جارہا تھا اور اگر خدا نے چاہا تو واپس آؤں گا۔ دلبر نے کہا کہ وہ تو پریوں کا گھر ہے۔ وہاں خطرہ ہے۔ جس طرح مُٹھی میں ہوا کو بند نہیں کیا جاسکتا، اُسی طرح آدمی اور پری کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ شہزادے نے ہنس کر کہا کہ اے دلبر فکر کرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔

اشعار:

وہ دامنِ دشتِ شوق کا خار
یعنی، تاج اُلملوک ِ دِل زار
اِک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد
صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سائے کو پتہ نہ تھا شجر کا
عنقا تھا نام جانور کا
ڈانڈا تھا اِرم کے بادشاہ کا
اِک دیو تھا پاسباں بلا کا

دانت اُس کے تھے گورکن قضا کے
دو نتھنے رہِ عدم کے ناکے
سر پر پایا بلا کو اُس نے
تسلیم کِیا قضا کو اُس نے
بھوکا کئی دِن کا تھا وہ ناپاک
فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک
بولا کہ چکھوں گا مَیں یہ اِنساں
اللہ اللہ شُکرِ اِحساں

تشریح:

اب مصیبت زدہ شہزادہ تاج الملوک جنگل وصحرا کی خاک چھانتا ہوا ایک ویران جگہ پر پہنچا کہ جہاں کوئی درخت نہ تھا۔ جہاں جانور نہیں تھے اور وہ ارم کے بادشاہ کی سرحد تھی۔ اُس جگہ کا محافظ ایک دیو تھا۔ اُس دیو کے دانت بڑے بڑے تھے گویا موت کے پنجے تھے اور اُس کی ناک کے نتھنے دُوسری دُنیا کے دو راستے تھے۔ وہ شیطان کئی دِنوں سے بھوکا تھا اور فاقوں سے بے حال ہو رہا تھا۔ اُس نے تاج الملوک کو دیکھ کر خُدا کا شُکر یہ ادا کیا اور کہا کہ اب اس کے گوشت کا مزہ لوں گا۔

اشعار:

شہ زادہ کہ مُنھ میں تھا اجل کے
اندیشہ سے رہ گیا دہل کے
پل مارنے کی ہُوئی جو دیری
سُبحان اللہ! شان تیری
اُشتر کئی جاتے تھے اُدھر سے
پُر آرد و رَوغن و شکر سے
وہ دیو لپک کے مار لایا
غُراتے ہُوئے شِکار لایا
مَیدا بھی، شکر بھی گھی بھی پایا
خاطِر میں یہ اُس بشر کے آیا
میٹھا اِس دیو کو کھلاؤ
گُڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو؟
حلوے کی پکا کے اِک کڑھائی
شِیر بنی دیو کو چڑھائی

ہر چند کہ تھا وہ دیو کڑوا | حلوے سے کیا مُنھ اُس کا میٹھا
کہنے لگا: کیا مزا ہے دِل خواہ | اے آدمی زاد! واہ وا
چیز اچھی کھلائی تو نے مُجھ کو | کیا اُس کے عوض میں دوؑں میں تُجھ کو

تشریح:

شہزادہ تاج الملوک دیو کو موت کی صورت دیکھ کر ڈر گیا۔ خُدا کی قدرت کہ اُسی اثنا میں اناج، گھی، شکر وغیرہ سے لدا ہوا اُونٹوں کا قافلہ اُدھر سے گزر رہا تھا۔ دیو فوراً اُونٹ مارلایا اور تھکا ہارا بے ہوش زمین پر گر پڑا۔ تاج الملوک نے سوچا کہ دیو کو میٹھا پکوان کھلا کر خوش کرنا چاہیئے۔ مثل ہے کہ پیار سے جو مرے اُسے زہر کیوں دو۔ تب تاج الملوک نے خوش ذائقہ حلوہ بنایا اور کڑاہی بھر اُس دیو کو کھلایا۔ اگر چہ دیو بڑا شیطان تھا لیکن مزے دار حلوہ کھا کر خوش ہوا۔ اُس نے تاج الملوک کو کہا کہ تم نے مجھے بہت عُمدہ چیز کھلائی ہے، اِس کے بدلے میں تجھے اگر کچھ چاہیئے تو مانگ۔

اشعار:

بولا وہ، کہ پہلے قَول دِیجے | پھر جو مَیں کہوں قبُول کیجے
وہ ہاتھ پر اُس کے مار کے ہاتھ | بولا، کہ ہے قول جان کے ساتھ
بولا وہ، کہ قَول اگر یہی ہے | بد عہدی کی پر نہیں سہی ہے
گُل زارِ اِرم کی ہے مُجھے دُھن | بولا کہ ارے بشر وہ گُلبُن!
خورشید کے ہم نظر نہیں ہے | اندیشے کا واں گُزر نہیں ہے
ہوتا نہ جو قَول کا سہارا | بچتا نہ یہیں تو، خیر ہارا
رہ جا، مرا بھائی ایک ہے اَور | شاید کُچھ اُس سے بن پڑے طَور
اِک ٹیکرے پر گیا، بُلایا | وہ مِثلِ صدائے کوہ آیا
حال اُس سے کہا، کہ قَول ہارا | ہے پیر یہ نوجواں ہمارا
مُشتاق اِرَم کی سَیر کا ہے | کوشش کرو، کام خَیر کا ہے

تشریح:

تاج الملوک نے کہا کہ مانگنے سے پہلے مجھے قول دو کہ میں جو مانگوں گا مجھے دو گے۔ دیو نے قول دیا۔ تب تاج الملوک نے بتایا کہ وہ باغ ارم میں جانا چاہتا ہے۔ دیو بولا کہ اے انسان وہ باغ ایسا ہے کہ وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔ اگر میں نے تجھے قول نہ دیا ہوتا تو زندہ نہ بچتا۔ خیر میرا ایک بھائی ہے۔ شاید وہ تمھارے کچھ کام آ سکے۔ دیو نے ایک ٹیکرے پر چڑھ کر اُسے بُلایا اور شہزادہ تاج الملوک کی تمام کہانی اُسے سُنا کر کہا کہ یہ ارم کی سیر کا مشتاق ہے۔ تم کوشش کرو اور اِس نیک کام میں اس کی مدد کرو۔ میں نے اِس نوجوان سے مدد کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔

2.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ مثنوی ''گلزار نسیم'' کے اشعار کی تشریح کیجیے۔

2۔ مثنوی گلزار نسیم کے ابتدائی اشعار کا خلاصہ بیان کیجیے۔

3۔ مثنوی گلزار نسیم کے اشعار کی مع حوالہ تشریح کیجیے۔

2.6 امدادی کتب

1۔ اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی ۱۱ سی، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

2۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

3۔ مثنوی سحر البیان، از میر حسن، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو

4۔ مثنوی گلزار نسیم، دیا شنکر نسیم لکھنوی، از رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

5۔ اردو مثنوی کا ارتقا، جدید اڈیشن، از پروفیسر عبدالقادر سروری، ناشر ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ

اکائی 3 ---------- میر تقی میرؔ کی مثنوی "میرے گھر کا حال"

ساخت

3.1 مثنوی "میرے گھر کا حال" کا تعارف

3.2 مثنوی "میرے گھر کا حال" کے اشعار

3.3 مثنوی "میرے گھر کا حال" کی فرہنگ

3.4 مثنوی "میرے گھر کا حال" کی تشریح

3.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

3.6 امدادی کتب

3.1 مثنوی "میرے گھر کا حال" کا تعارف

میرؔ اُردو شاعری کے ولیؔ کے بعد دوسرے بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ متعدد مثنویاں لکھی ہیں۔ اُن کی شاعری کی مختلف جہتیں ہیں۔ اُن کی شاعری میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ ان دونوں کی آمیزش سے میرؔ کی شاعری کا خمیر اُٹھا ہے۔ اُن کی شاعری میں غمِ دوراں کے آگے غمِ جاناں دب جاتا ہے۔ غمِ دوراں کا غم اُن کا اپنا غم بن جاتا ہے۔ اور یہی خوبی اُنھیں بڑا شاعر بناتی ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں میرؔ اُردو شاعری کا سب سے بڑا عاشق شاعر ہے۔ دوسرے لفظوں میں میرؔ کی شاعری عشقیہ شاعری ہے۔ غزلوں میں میرؔ بطور عاشق اس طرح سامنے نہیں آتا جس طرح مثنویوں میں وہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ عشقیہ مثنویوں کے علاوہ میرؔ نے ہجویہ مثنویاں بھی لکھی ہیں اور "گھر کا حال" اس سلسلے کی کڑی ہے۔ اُن کی ہجویہ مثنویوں میں "جھوٹ"، "گھر کا حال"، "در ہجو خانۂ خود"،

''جوشِ عشق'' قابلِ ذکر ہیں۔

مثنوی نگاری میں انھیں منظر نگاری پر قدرت حاصل ہے۔ میرؔ کی زبان شستہ اور پاکیزہ ہے۔ دل کے خیالات کو جذبے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں نہایت سادگی سے ادا کر دیتے ہیں۔ میرؔ بنیادی طور پر درد و غم کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کی غزلوں میں جو کیفیت اور فضا حاوی رہتی ہے وہی کیفیت ان کی مثنوی نگاری کا بھی خاصا ہے۔

3.2 مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کے اشعار

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال
اس خرابے میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے

کوچۂ موج سے ہے آنگن تنگ
کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چار دیواری سو جگہ سے خم
تر تنک ہو تو سُوکھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے مائی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا تھمے مینھ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اس چکش کا علاج کیا کریے
راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے

جا نہیں بیٹھنے کو مینھ کے بیچ
ہے چکش سے تمام ایواں کیچ

آنکھیں بھر بھر کے یہ کہیں ہیں سب
کیوں کہ پردہ رہے گا یارب

جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات
گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات

باؤ میں کانپتے ہیں جو تھر تھر
ان پہ رڈا رکھے کوئی کیوں کر

کیچ لے لے کے جوں توں چھوپا ہے
چھونپا کا ہے کو ہے کہ تھوپا ہے

تس کو پھر پرچھتی بھی ہے ہی نہیں
ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں

ڈھانکو دیوار یا اٹھا رکھو
یا ہمارے لیے بچھا رکھو

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق — سو شکستہ تراز دل عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک — کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیری ہے خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے — کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا — شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں — پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے — جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے
رکھ کے دیوار ایدھر اودھر سے — لا کے یارب بتاؤں کس گھر سے
چار پائی جب اس میں بچھوائی — پہلے چلپاسہ ہی نظر آئی
سام ابرص ہے کہ ہے دوائے خراج — ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج
پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے — ڈانس اک ایک جیسے مکھی ہے
آگے اس حجرے کے ہے اک ایواں — وہی اس تنگ خلق کا ہے مکاں
کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ — اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھو کوئی سپنولیا ہے پھرے — کبھو چھت سے ہزار پا ہے گرے
کوئی تختہ مکاں سے ٹوٹا ہے — کوئی داسہ مکاں سے چھوٹا ہے
دب کے مرنا ہمیشہ مدّ نظر — گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مٹی تو وہ جو ڈالی چھت پر ہم — تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم
مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت — ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت
پھرسے اس مٹی میں کرختی ہے — تختہ تختہ ہوئی یہ سختی ہے
دیں ہیں اڑواڑیں پھر جو حد سے زیاد — چل ستوں سے مکان دے ہے یاد
اینٹ مٹی کا در آگے ڈھیر — کرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

جیتے ہیں جب تلک نہیں پہونچی
ورنہ کیا بس ہے جو یہیں پہنچی

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال
پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال

طوطا، مینا تو ایک بابت ہے
پُودنا پھدکے تو قیامت ہے

کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار
تھرتھراوے بھنبھیری سی دیوار

ہوگیا ہے جو اتفاق ایسا
شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا

ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب
اُڑ بھنبھیری کہ ساون آیا اب

تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ
کہیں کھسکے تو ہے قیامت تنگ

ایک دن ایک کوا آ بیٹھا
بے گماں جیسے ہوا آ بیٹھا

چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور
کہ نہ حائط میں کچھ رہا تھا زور

ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے
دوڑے اُچھلے کہ ہال ہال چلے

جو وہ زاغ چار پاؤں پھرا
ایک کالا پہاڑ آن گرا

مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی
جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی؟

سان کر خاک لگ گئے دوچار
بارے جلدی درست کی دیوار

اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے
برسے ہے یک خرابی گھر در سے

اُکھڑے پکھڑے کواڑ ٹوٹی وصید
زلفی زنجیر ایک کہنہ حدید

خاک لوہے کو جیسے کھاوے پاک
چھیڑ لیجئے تو پھر نرمی ہے خاک

بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں
قدر کیا گھر کی جب کہ میں ہی نہ ہوں

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور
ہے خرابی سے شہر میں مشہور!

جس سے پوچھو اسے بتادے شتاب
ساری بستی میں ہے یہی تو خراب

ایک چھپّر ہے شہر دلّی کا
جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا

بانس کی جا دیے تھے سر کنڈے
سووے مینہوں میں سب ہوئے ٹھنڈے

گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب
پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

مینھ میں کیوں نہ بھیگیے یک سر
پھوس بھی تو نہیں ہے چھپّر پر

مٹی ہو کر گرا ہے سب والا
وہ رہے یاں جو ہووے ڈھب والا

واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا
یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

حال کس کو ہے اولتی کا یاد
مگری اس جھگڑے میں گئی برباد

کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا
کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لا لا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں
بیچ کوئی لڑاؤں فند کروں

یاں تو جھانکے ہزار ہیں تنہا
کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بس کہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی
کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

مجھ سا کیا واقعی ہوا چارا
آسماں جو پھٹے تو کیا چارا

بان جھینگر تمام چاٹ گئے
بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

تنکے جان دار ہیں جو بیش و کم
تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم

ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور
ایک مگری پہ کر رہی ہے شور

پوچھ مت زندگانی کیسی ہے
ایسے چھپّر کی ایسی تیسی ہے

کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی
چار پائی ہمیشہ سر پہ رہی

بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو!
کونے ہی میں کھڑا رہا یک سو

ڈیوڑھی کی یہ خوبی در ایسا
چھپّر اس چو چلے کا گھر ایسا

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں

کیڑا اک ایک پھر مکوڑا ہے
سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چنگلی پر
اک انگھوٹھا دکھا دے انگلی پر

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے رانوں کو گھس گئیں پوریں
ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

ہاتھ تکیے پہ گہہ بچھونے پر
گہو چادر کے کونے کونے پر

سلسلہ یا جو پانتی کے اور
وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور

توشک ان رگڑوں ہی میں سب پھائی
ایڑیاں رگڑتے ہی کاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گئے سب بان
ساری کھاٹوں کی چولیں نکلیں ندان

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو
پائے پٹی لگائے کونے کو

جب نہ تب پنڈے پر لیے پائے
سیتلا کے سے دانے مرجھائے

سوتے تنہا نہ بان میں کھٹمل
آنکھ ، مونہہ، ناک، کان، میں کھٹمل

کہیں پھڑکا کہ جی سے تاب گئی
آنکھ سے تاپگاہ خواب گئی

ایک ہتھیلی پہ ایک گھائی میں
سینکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیے
کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے

یہ جو بارش ہوئی تو آخر کار
اس میں سی سالہ وہ گری دیوار

آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ
تھے جو ہمسائے وے ہیں ہمخانہ

ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے
جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے

3.3 مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کی فرہنگ

الفاظ	معنی
سقف	چھت، کوٹھا، شامیانہ
کیچ	کیچڑ
پرچھتی	بارش سے بچنے کے لیے چھوٹا چھپر، مچان
واثق	پکا، مضبوط، مستقل
داسہ	لکڑی کا وہ ٹکڑا جو زینے کے اگلے حصے پر لگا ہوتا ہے
پاکھے	پہلو، بازو، دیوار
صحنک	طباقچہ، رکابی
بان	باریک رسی چارپائی کے لیے
توشک	روئی دار بسترہ
پنڈلی	گوڑا۔ ٹخنے اور گھٹنے کے درمیان ٹانگ کا حصہ
کنگنی	دیوار کا کنارہ
ابرص	چھوڑا

الفاظ	معنی
خیلا	احمق، بیوقوف
رذا	تہ، پرت، چٹائی کی تہ
حجرہ	خلوت خانہ یادِ خدا کے لیے
پودنا	ایک چھوٹا سا پرندہ
چلپاسہ	چھپکلی
جھنجھیری	ایک پتنگا جو برسات میں ہوتا ہے
تیز،	چالاک، چست
مگری	چھپر کا اوپر والا اور پشت کا حصہ
خیلا	لغویا پھوہڑ، احمق
چھنگلی	ہاتھ پاؤں کی سب سے چھوٹی انگلی
ندان	آخرکار، بعد میں
گھائی	دو انگلیوں کے درمیان کی جگہ،
فند	فریب، دھوکا

3.4 مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کی تشریح

اشعار

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال — اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک وتیرہ زنداں ہے — سخت دل تنگ یوسف جاں ہے
کوچۂ موج سے ہے آنگن تنگ — کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم — تر تنگ ہو تو سُوکھتے ہیں ہم
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی — آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

تشریح:

شاعر اپنے گھر کا حال خود بیان کر رہا ہے۔ شاعر کے مطابق گھر کا حال بیان کرنا نہایت ہی مشکل ہے اور اس تباہ حال مکان میں وہ خود تباہ ہو رہا ہے۔ گھر کی حالت کسی اندھیرے قید خانے کی سی ہے کہ جہاں جانِ یوسف کا دِل سخت تنگ ہے، نہایت مشکل میں ہے۔ خود کو یوسف کہہ کر قید کی سختی کو مزید واضح کر دیا ہے۔ ہلکی سی ہوا بھی اس مکان کے آنگن کی حالت خراب کر دیتی ہے اور کوٹھری کی حالت یہ ہے کہ یہ بس گرا چاہتی ہے۔ چار دیواری کی حالت اتنی خستہ ہے کہ سو جگہ جھکی پڑی ہے۔ ہلکی سی بارش سے شاعر کی جان حلق تک آ جاتی ہے۔ مکان کی مٹی جگہ جگہ سے گر رہی ہے جسے دیکھ شاعر اپنی زندگی کو کوس رہا ہے کہ کیسی بے لطف و بے مزہ زندگی ہم نے گزاری ہے۔

اشعار

کیا تھمے مینھ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام
اس چکش کا علاج کیا کریئے
راکھ سے کب تلک گڑھے بھریئے
جا نہیں بیٹھنے کو مینھ کے بیچ
ہے چکش سے تمام ایواں کیچ
آنکھیں بھر بھر کے یہ کہیں ہیں سب
کیوں کہ پردہ رہے گا یارب
جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات
گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات

تشریح:

چھت چھلنی کی صورت ہو گیا ہے اور برسات کا پانی تھمتا ہی نہیں ہے اور آنکھیں ہیں کہ ہر دم چھت کی جانب لگی رہتی ہیں کہ کب برسات تھمے اور چھت کا برسنا بند ہو۔ مکان ایسے حالات میں بلبلوں کا اڈا ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک تو برسات کی وجہ سے بیٹھنے کی جگہ نہیں رہی۔ اُس پر تمام مکان کیچڑ سے بھرا ہوا ہے۔ لوگ دیکھ کر افسوس کرتے ہیں کہ ایسے مکان میں پردہ کیوں کر رہ سکتا ہے جس میں دن رات برسات کی جھڑی لگی رہتی ہے۔

اشعار:

باؤ میں کانپتے ہیں جو تھر تھر
ان پہ رڈار کھے کوئی کیوں کر
کیچ لے لے کے جوں توں چھوپا ہے
چھونپا کا ہے کو ہے کہ تھوپا ہے
تس کو پھر پرچھتی بھی ہے ہی نہیں
ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں
ڈھانکو دیوار یا اٹھا رکھو
یا ہمارے لیے بچھا رکھو
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق
سو شکسہ تراز دل عاشق

تشریح:

ایسے مکان کی مرمت کیسے ہو سکتی ہے جس کی دیواریں ہلکی سی ہوا چلنے سے کانپ کانپ جاتی ہیں۔ ان پر رڈا یعنی چادر بھی سوکھانے کے لئے نہیں ڈالی جا سکتی ہے۔ دیواریں اس قدر خستہ ہو چکی ہیں کہ چادر کا بوجھ بھی نہیں اُٹھا سکتیں۔ اس پر کہیں پر چھتی بھی نہیں ہے کہ جس کے نیچے بارش سے بچا جا سکے۔ لے دے کے ایک پھٹا بوریا ہے۔ اب اس کو کہاں ڈالیں اور اس سے کیا کیا بچائیں۔ دیواروں پر ڈالیں یا خود کو بچائیں؟ کیچڑ لے لے کر جو جگہ جگہ سوراخ بند کیے ہیں یا اُن پر لیپ کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ لیپ کیا کیا ہے گویا تھوپ دیا ہے۔ گھر میں ایک حجرہ یعنی کوٹھری کہ جو قدرے پختہ تھی سو اُس کی حالت بھی خراب ہو گئی ہے وہ بھی عاشق کے دِل کی طرح شکستہ ہے۔

اشعار:

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک	کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیری ہے خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے	کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا	شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں	پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے	جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے

تشریح:

حجرے کی حالت ایسی ہے کہ اس میں کئی سوراخ ہو چکے ہیں اور کہیں کہیں مٹی کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ چھچھوندروں اور مچھروں نے اس میں ڈیرا جما لیا ہے۔ کھڑکیاں بھی خستہ حال ہیں، دیواروں کے پتھر اپنی جگہ سے کھسک چکے ہیں اور اینٹ اور چونا بھی گرنے لگا ہے لیکن دل ہے کہ اسی حجرے میں اٹکا ہوا ہے۔

اشعار:

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ
س کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ

کبھوکوئی سپنولیا ہے پھرے
کبھو چھت سے ہزار پا ہے گرے

کوئی تختہ مکاں سے ٹوٹا ہے
کوئی داسہ مکاں سے چھوٹا ہے

دب کے مرنا ہمیشہ مدّ نظر
گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر

مٹی تو وہ جو ڈالی چھت پر ہم
تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم

تشریح:

مکان کے شہتیر اور تختے دھوئیں سے کالے پڑ چکے ہیں۔اور ہماری نگاہ ہمیشہ چھت کی طرف لگی رہتی ہے کہ جانے کب چھت سے کیا آن گرے۔مکان کو سہارا دینے والا لکڑی کا داسہ یعنی کھمبا بھی مکان سے الگ ہونے کو ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ دب کر مرنے کا خوف لاحق رہتا ہے۔جب چھت کی حالت سدھارنے کے لیےاس پر مٹی ڈالی تو دیکھا کہ شہتیروں کی حالت بھی کمان کی سی ہوگئی ہے گویا وہ بھی ٹیڑھے ہوگئے ہیں۔

اشعار:

مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت
ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت

پھرے اس مٹی میں کرختی ہے
تختہ تختہ ہوئی یہ سختی ہے

دیں ہیں اڑواڑیں پھر جو حد سے زیاد
چل ستوں سے مکان دے ہے یاد

اینٹ مٹی کا در آگے ڈھیر
گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

جیتے ہیں جب تلک نہیں پہونچی
ورنہ کیا بس ہے جو یہیں پہنچی

تشریح:

بے چین ہو کر جو زیادہ مٹی بچھائی تو دیکھا کہ ہر کڑی پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ہے۔ مٹی چھت کو ڈھاپنے کے بجائے چھت کی حالت گیر کر رہی ہے۔ چھت کی مضبوطی کے لیے جو حد سے زیادہ اڑواڑیں یعنی لکڑی کے کھمبے دے رکھے ہیں اُن سے مکان چل ستوں کی صورت ہو گیا ہے۔ مکان کی منڈیر گر رہی ہے جس کی وجہ سے دروازے کے سامنے اینٹ اور مٹی کا ڈھیر ہو گیا ہے۔ اس سب سے جان پر بن آئی ہے۔

اشعار:

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال	پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
طوطا، مینا تو ایک بابت ہے	پُودنا پھُدکے تو قیامت ہے
کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار	تھرتھراوے بھنبھیری سی دیوار
ہوگیا ہے جو اتفاق ایسا	شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا
ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب	اُڑ بھنبھیری کہ ساون آیا اب

تشریح:

دیواروں کی حالت اتنی خراب ہے کہ یہ طوطا مینا جیسے بڑے پرندوں کا وزن تو کیا سنبھالیں گی، پدڑی اور پُودنا جیسے چھوٹے پرندوں کا معمولی بوجھ بھی نہیں اُٹھا سکتیں۔ دیواریں پتنگوں کی صورت تھرتھراتی ہیں اور ساون کا موسم کتنا نہایت ہی دشوار ہے۔ کیا کہوں کہ یہ سب ہمیں کتنا ناگوار گزرتا ہے۔ اب تو لوگ بھی بے چین ہو کر کہنے لگے ہیں کہ پتنگے اب تو اُڑ کہ ساون بھی آ گیا ہے۔

اشعار:

تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ
کہیں کھسکے تو ہے قیامت تنگ

ایک دن ایک کوا آ بیٹھا
بے گماں جیسے ہوا آ بیٹھا

چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور
کہ نہ حائط میں کچھ رہا تھا زور

ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے
دوڑے اُچھلے کہ ہال ہال چلے

تشریح:

اسی صورتِ حال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ کبھی جو کوئی تیتری آ جائے تو بھی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ کہ کہیں یہ دیوار پر آن بیٹھی تو قیامت برپا ہو جائے گی۔ ایک دن ایک کوا اس مکان کی دیوار پر آ بیٹھا، جیسے کوئی طوفان آ گیا ہو۔ آس پاس کے لوگ دوڑے دوڑے آئے کہ اب یہ مکان گرا ہی گرا۔

اشعار:

جو وہ زاغ چار پاؤں پھرا
ایک کالا پہاڑ آن گرا

مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی
جی ڈہا اور چھاتی بھی ڈھسکی؟

سان کر خاک لگ گئے دوچار
بارے جلدی درست کی دیوار

اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے
برسے ہے یک خرابی گھر در سے

تشریح:

وہ کوا چھت پر تھوڑی دیر بیٹھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی کالا پہاڑ چھت پر آ گرا ہو۔ کئی جگہ سے چھت کی مٹی نیچے گر پڑی اور چند پتھر بھی زمین پر آ گئے۔ جتنی خرابیاں اس گھر میں ہیں، کھنڈر بھی اس سے اچھے ہی ہوں

گے۔کھنڈر کے درودیوار بھی اس خستہ حال مکان سے کچھ بہتر ہی ہوں گے۔

اشعار:

اُکھڑے پکھڑے کواڑ ٹوٹی وصید
زلفی زنجیر ایک کہنہ حدید

خاک لوہے کو جیسے کھاوے پاک
چھیڑ لیجئے تو پھر نرمی ہے خاک

بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں
قدر کیا گھر کی جب کہ میں ہی نہ ہوں

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور
ہے خرابی سے شہر میں مشہور!

جس سے پوچھو اسے بتادے شتاب
ساری بستی میں ہے یہی تو خراب

تشریح:

جیسے مٹی میں رہ کر لوہا زنگ آلودہ ہو جاتا ہے ویسے ہی یہ مکان بھی زنگ خوردہ ہو چلا ہے۔دستور کے اُلٹ میں جب گھر میں رہتا ہوں تو اس کا دروازہ بند رکھتا ہوں کہ جب میں ہی نہ ہوں تو اس کی کیا قدر؟ اور پھر گھر بھی ایسا کہ جو شہر بھر میں اپنی خرابی کے باعث مشہور ہو۔جس سے بھی پوچھیے فوراً بتادے گا کہ ہاں شہر دِلی میں شیخ چلی کا ایک چھپر ہے۔

اشعار:

ایک چھپّر ہے شہر دلّی کا
جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا

بانس کی جا دیے تھے سر کنڈے
سووے مینھوں میں سب ہوئے ٹھنڈے

گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب
پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

مینھ میں کیوں نہ بھگیئے یک سر
پھوس بھی تو نہیں ہے چھپّر پر

مٹی ہو کر گرا ہے سب والا
وہ رہے یاں جو ہووے ڈھب والا

واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا
یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

تشریح:

بانس کی جگہ مکان میں سرکنڈوں کا استعمال ہوا تھا اس لیے وہ بھی بہت جلد جواب دے گئے۔ سب دیواریں بارش کے پانی سے گیلی رہنے لگی ہیں۔ برسات کے موسم میں بھیگنا لازم ہے کہ چھت پر چھپر بھی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں یہاں وہی رہ سکتا ہے جو کچھ خاص طریقے جانتا ہو۔ شاعر کہتا ہے کہ جہاں پانی ٹپکتا ہے میں وہاں سے سرک کر دوسری جگہ جا بیٹھتا ہوں۔ پھر جب وہاں بھی بھیگنے لگتا ہوں تو وہاں سے بھی ہٹ جاتا ہوں۔ گویا اسی طرح وقت بتاتا ہوں۔

اشعار:

حال کس کو ہے اولتی کا یاد
مگری اس جھگڑے میں گئی برباد

کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا
کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لا لا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں
پیچ کوئی لڑاؤں فند کروں

یاں تو چھانکے ہزار ہیں تنہا
کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بس کہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی
کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

تشریح:

چھپر کے پچھلے حصّے کا حال کسے معلوم، یہاں تو مگری یعنی چھپر کا اوپر والا حصّہ بھی تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ تھالی، پیالا، ہانڈی اور ٹھیکرے تک چھت سے گرنے والے پانی کے لیے کام آ گئے ہیں۔ دو چار جگہ سے پانی گرتا تو کچھ علاج بھی ممکن تھا، یہاں تو اتنی جگہوں سے پانی ٹپکتا ہے کہ مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس ٹپکتے ہوئے پانی سے میرے کپڑے بھی ایسے ہو گئے ہیں جیسے کسی نے اُن پر چھڑکاؤ کیا ہو۔

اشعار:

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں — کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں
مجھ سا کیا واقعی ہوا چارا — آسماں جو پھٹے تو کیا چارا
بان جھینگر تمام چاٹ گئے — بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے
تنکے جان دار ہیں جو بیش و کم — تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم
ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور — ایک مکڑی پہ کر رہی ہے شور
پوچھ مت زندگانی کیسی ہے — ایسے چھپر کی ایسی تیسی ہے
کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی — چار پائی ہمیشہ سر پہ رہی
بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو! — کونے ہی میں کھڑا رہا یک سو
ڈیوڑھی کی یہ خوبی در ایسا — چھپر اس چو چلے کا گھر ایسا
جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ — پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

تشریح:

کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں ہولی کھیل رہا ہوں اور کوئی مجھے احمق سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ پر آسمان پھٹ پڑا ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ گیلے ہو کر بانس بھی ٹوٹ گئے ہیں اور رسیوں کو دیمک لگ چکا ہے۔ چھت پر جو تھوڑے بہت تنکے بچے ہیں، وہ چڑیوں کی نذر ہو گئے ہیں۔ اب ایسے میں یہ مت پوچھیے کہ بتاؤ زندگانی کیسی ہے؟ اس تباہ حال چھپر کی ایسی کی تیسی کہ جس کے نیچے کبھی آرام نصیب نہیں ہوا اور چار پائی ہمیشہ سر پر رہی۔ جہاں دو لمحے بھی آرام کے نصیب نہیں ہوئے اور ہمیشہ کونے میں کھڑے رہ کر ہی زندگی گزری۔ اُس پر اس مکان کی ڈیوڑھی بھی کچھ کم نہیں۔ اُس کی حالت بھی چھپر جیسی ہی ہے۔ گھر میں جو چار پائی ہے اُس کے پائے بھی ٹوٹنے کو ہیں۔

اشعار:

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں

کیڑا اک ایک پھر مکوڑا ہے
سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر
اک انگھوٹھا دکھا دے انگلی پر

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے رانوں کو گھس گئیں پوریں
ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

ہاتھ تکیے پہ گہہ بچھونے پر
کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلہ یا جو پا نتی کے اور
وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور

تو شک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی
ایڑیاں رگڑتے ہی کاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گئے سب بان
ساری کھاٹوں کی چولیں نکلیں ندان

تشریح:

چارپائی پر اتنے کھٹمل ہیں کہ اُس کا رنگ بھی کالا ہو گیا ہے جس وجہ سے رات کو بھی چین نہیں۔ رات کو اس چارپائی پر بستر بچھانا گویا مصیبت کو بلانا ہے۔ شام سے ہی کیڑے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ کوئی ہاتھ کی انگلیوں میں گھستا ہے تو کوئی پاؤں کی انگلیوں میں۔ حالاں کہ میں نے بہت سے کھٹملوں کو مار ڈالا ہے لیکن وہ تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ میرا بس نہیں چلتا۔ رانوں کو ملتے ملتے انگلیوں کی پوریں گھس گئی ہیں اور ناخن بھی لال ہو گئے ہیں۔ ہاتھوں کو ایک پل بھی آرام نہیں اور یہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ٹٹولتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ سر سے پاؤں تک مسلسل چلتا رہتا ہے اور اس وجہ سے بستر بھی پھٹ چکا ہے۔ گویا ہم ساری عمر ایڑیاں ہی رگڑتے رہے۔ اسی وجہ سے چارپائی کی رسیاں بھی جواب دے چکی ہیں اور اس کی چولیں بھی ہل چکی ہیں۔

اشعار:

ہو گھڑی دو گھڑی تو دتکاروں	ایک دو کُتے ہوں تو میں ماروں
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں	چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز	کتّوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز
وہ جو ایواں تھا حجرے کے آگے	اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے
کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا	پانی جز جز میں اس کے پیٹھ گیا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا	ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا
میں تو حیران کار تھا اپنا	کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا
اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر	خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر
چرخ کی کجروی نے پیسا تھا	پر خدا مجھ سے میرا سیدھا تھا
کتنے اک لوگ اس طرف دھائے	یا ملک آسمان سے آئے

تشریح:

تھوڑی دیر کی بات ہوتی تو کُتوں کو مارتا یا دُتکار دیتا۔ یہاں تو حالت یہ ہے کہ چار کُتے جاتے ہیں تو چار نئے آجاتے ہیں۔ اُن کی عف عف سے دماغ پھٹ جاتا ہے۔ یہ حالت نا قابلِ بیان ہے۔ اب تو حجرے کے آگے کا حصّہ بھی تباہ ہونے کو ہے اور کوٹھا بھی بارش کی وجہ سے بیٹھنے لگا ہے۔ مکان گرنے لگا تو یوں لگا کہ سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ میں حیران تھا کہ اس مشکل گھڑی میں کوئی میرا مددگار نہ تھا۔ میرے آس پاس اینٹ، پتھر پڑے تھے اور پورا گھر زمین دوز ہو چکا تھا۔ یہ سارے ستم مجھ پر آسمان ڈھا رہا تھا لیکن میرا خدا مجھ پر مہربان تھا جبھی تو اچانک لوگ میری مدد کو دوڑے دوڑے آئے۔

اشعار:

شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں
چار و ناچار پھر رہا میں وہیں

اب وہی گھر ہے بے سرو سایہ
اور میں ہوں وہی فرد مایہ

دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس
خواب راحت ہے یاں سے سوسو کوس

قصہ کو تہ دن اپنے کھوتا ہوں
رات کے وقت گھر میں سوتا ہوں

نہ اثر نام کا نہ کچھ در کا!!
گھر ہے کا ہے کا نام ہے گھر کا!!

تشریح:

شہر بھر میں مجھے اور کوئی جگہ رہنے کو نصیب نہ ہوئی اور مجبوراً پھر اسی بوسیدہ مکان میں واپس آنا پڑا۔ اب وہی خستہ حال گھر ہے جہاں دن رات مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختصر قصہ یہ ہے کہ دن کسی طرح سے بتاتا ہوں اور رات کو اسی گھر میں سوتا ہوں جس کے در و دیوار کا کچھ پتہ نہیں، جو محض نام کا گھر ہے۔

3.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کے اشعار کی تشریح کیجئے۔
2۔ مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کے اشعار کا خلاصہ بیان کیجئے
3۔ مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کے اشعار کی خصوصیات بیان کیجئے

3.6 امدادی کتب

1۔ اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی ۱۱ سی، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲
2۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
3۔ مثنوی میرے گھر کا حال، از میر تقی میر، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو

اکائی 4:   میر حسنؔ کے حالات زندگی

4.1 تمہید

4.2 میر حسنؔ کے حالات زندگی

4.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

4.4 امدادی کتب

4.1 تمہید

میر حسن اپنے دَور کے اہم شاعر اور مشہور معرکہ آرا شخصیت میر ضاحک کے صاحب زادے تھے۔ قدرت نے اسی خانوادے میں میر انیس کو بھی جنم دیا۔ میر انیس کے بیٹے نے ''پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں '' کہہ کر جس خاندانی تفخر کی بات کی، اس کی پشت پر میر حسن کی شخصیت سب سے مضبوط کڑی ہے۔ میر حسن کی عظمت اگر تسلیم نہیں کی گئی ہوتی تو انیس سے پہلے اس خاندان کا شاید ہی کوئی جاننے والا ہوتا۔ میر حسن محض پچاس برسوں میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ پانچ سو سے زیادہ غزلیں اور بارہ چھوٹی بڑی مثنویاں انھوں نے یادگار چھوڑیں۔ دیگر اصناف میں بھی اُن کی مشق جاری تھی لیکن اپنی موت سے دو سال پہلے اگر سحرالبیان جیسی عدیم المثال مثنوی انھوں نے نہیں تخلیق کی ہوتی تو میر، درد اور سودا جیسے بزرگ معاصرین کے نہ وہ ہم پلّہ قرار دیے جاتے اور نہ ہی اردو کی ادبی تاریخ کے لیے سنگِ میل مانے جاتے۔

4.2 میر حسنؔ کے حالاتِ زندگی

میر غلام حسن نام، حسنؔ تخلص، 1737ء/۱۱۴۵ھ میں دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر غلام حسن ضاحک تھا۔ بزرگ ایران سے دہلی آئے اور یہیں سکونت اِختیار کرلی۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ میر ضاحکؔ ایک اچھے شاعر تھے۔ آج تک ضاحکؔ وسوداؔ کے کارنامے مشہور ہیں۔ میر ضاحکؔ اور سوداؔ کی آپس میں کم ہی بنتی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی ہجو لکھتے رہتے تھے۔ میر حسنؔ فطری شاعر تھے۔ شروع میں والد سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد میں خواجہ میر دردؔ سے استفادہ کیا۔ دلّی کے حالات چوں کہ خراب رہنے لگے تھے لہٰذا آغازِ شباب ہی میں والد کے ہمراہ دلّی چھوڑ کر میر حسنؔ فیض آباد آ گئے۔ وہاں نواب سالار جنگ بہادر کی ملازمت اِختیار کی۔ جب نواب آصف الدولہ نے ۱۷۷۵ء میں تخت نشین ہونے کے بعد لکھنؤ کو آباد کیا تو یہ بھی فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے اور ضیاء الدین ضیاؔ کے شاگرد ہو گئے۔ میرؔ اور سوداؔ کا رنگ مرغوب تھا۔ شاعری میر حسن نے وراثت میں پائی تھی۔ زندگی ہی میں میر حسنؔ بامِ شہرت پر پہنچ گئے اور بقول محمد حسین آزادؔ زمانے نے اُن کی سحر البیانی پر تمام تذکرہ نویسوں سے محضرِ شہادت لکھوایا۔ ۱۷۸۶ء/۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ شاعر شیریں بیان سے مصحفیؔ نے تاریخِ وفات نکالی۔ ایک دیوان جو جملہ اصنافِ سخن پر حاوی ہے، گیارہ مثنویاں اور فارسی زبان میں تذکرائے شعرائے اُردو جو ۱۷۷۷ء/۱۱۸۷ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھا گیا، یادگار ہیں۔ اُردو فارسی کے زبردست عالم تھے۔ میر ضاحکؔ سے بھی اصلاح لیتے رہے۔ میر حسنؔ کی شاعرانہ زندگی کا لافانی کارنامہ اُن کی مثنوی ''سحر البیان'' ہے۔ یہ مثنوی میرِ حسنؔ اور قصّہ بدرِ منیر کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس مثنوی نے میرِ حسنؔ کو زندہ جاوید کر دیا۔ یہ صرف میر حسنؔ ہی کا نہیں بل کہ اُردو ادب کا ایک عظیم شاہکار ہے۔

مثنوی نگاری میں میر حسنؔ کا مرتبہ سب سے بُلند ہے۔ اُردو ادب میں مثنویاں بے شمار لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ لیکن اس کا بدل نہ ہے اور نہ ممکن ہوگا۔ اس مثنوی کا نام اس کی صفائی بیان، لطفِ محاورہ، شوخیٔ مضمون اور طرزِ ادا، نزاکت اور سوال و جواب کی نوک جھونک کی سحر البیانی کی وجہ سے ''سحر البیان'' رکھا گیا۔ میر حسنؔ نے خود اپنی مثنوی کی تعریف ایک جگہ کی ہے اور خوب کی ہے۔

نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں
نہیں مثنوی یہ ہے سحر البیان

4.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ میر حسن کا پورا نام کیا ہے؟
2۔ آپ کا انتقال کس سن میں ہوا؟
3۔ میر حسن نے کُل کتنی مثنویاں لکھی ہیں؟
4۔ میر حسن نے کون سا ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی وجہ سے اُردو ادب میں اُن کا نام زندہ و جاوید ہو گیا؟
5۔ یہ مثنوی دوسرے کس نام سے مشہور ہے؟
6۔ میر حسن کس مقام پر پیدا ہوئے؟

4.4 امدادی کتب

1۔ مثنویات میر حسن، از میر حسن، ناشر، منشی نول کشور، لکھنو
2۔ اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی II سی، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱
3۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔

اکائی 5: میر تقی میرؔ کے حالات زندگی

5.1 تمہید
5.2 میر تقی میرؔ کے حالات زندگی
5.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات
5.4 امدادی کتب

5.1 تمہید

ہر شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد رونما ہونے والے واقعات، حادثات، اس کی ذاتی زندگی میں پیش آنے والے تجربات اور اس سلسلے میں اس کے تاثرات ہی دراصل اس کی شاعری اور فن کے رخ کا تعین کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ماحول اور معاشرے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ لاشعوری طور پر شاعر اپنی فکر کا رخ موڑتا چلا جاتا ہے اور یوں اس کی شاعری وقت کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ میر تقی میر ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے جو سیاسی، سماجی، ملکی اور معاشی اعتبار سے سخت انتشار اور افراتفری کا دور تھا۔ مغل مرکز کمزور پڑ چکا تھا۔ ہندوستان کے بہت سے صوبے خودمختار ہو چکے تھے پورا ملک لوٹ مار کا شکار تھا۔ بیرونی حملہ آور آئے دن حملے کرتے تھے اور عوام و خواص کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے۔ لوگ بھوکے مرنے لگے اور دولت لٹنے سے اقتصادی بدحالی کا دور شروع ہوا۔ میر اپنے اس دور کے احساس زوال اور انسانی الم کے مظہر ہیں۔ ان کی شاعری اس تمام شکست و ریخت کے خلاف ایک غیر منظم احتجاج ہے۔ میر کے تصور غم کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں کہ ''میر کا سب سے بڑا مضمون شاعری

میں ان کا غم ہے۔ غم والم میر کے مضامین شاعری سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ غم میر کا ذاتی غم بھی تھا اور یہی انسان کی ازلی اور ابدی تقدیر کا غم بھی تھا۔ یہ سارے غم میر کی شاعری میں جمع ہو گئے ہیں۔''

5.2 میر تقی میرؔ کے حالات زندگی

نام میر محمد تقی اور میرؔ تخلص تھا۔ ۱۷۲۲ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ میرؔ کے دادا شاہی فوج میں فوجدار تھے اور والد میر متقی علی مشہور صوفی بزرگ تھے۔ دس بارہ سال ہی کی عمر تھی کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ میرؔ نے خود اس قصے کا ذکر ''ذکرِ میرؔ'' میں بڑے دِل خراش انداز میں کیا ہے۔ وہ لوگ جواُن کے والد کے ہوتے اُن کے پاؤں کی مٹی کو سُرمے کی طرح آنکھوں سے لگاتے تھے، باپ کی موت ہوتے ہی روگردانی کرنے لگے۔ جوسلوک میرؔ سے اُنھوں نے کیا، کوئی دُشمن بھی نہیں کرتا۔ اُن کی ساری جائیداد ہڑپ لی۔ اس سلوک کی وجہ سے میرؔ کا بچپن بڑی مصیبتوں میں گزرا۔ میرؔ کو چھوٹی سی عمر میں تلاشِ معاش کے لیے دہلی جانا پڑا۔ وہاں کسی طرح اُن کی رسائی صمصام الدولہ تک ہوئی۔ اُنھوں نے میرؔ کے لیے ایک روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ میرؔ آگرہ لوٹ آئے۔ یہ وظیفہ مُشکل سے ایک سال چلا ہوگا کہ نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر دیا اور اُس میں صمصام الدولہ مارے گئے۔ میرؔ کو دوبارہ آگرہ چھوڑنا پڑا۔ لیکن کہتے ہیں کہ اس بار میرؔ کو کسی دوشیزہ سے عشق ہو گیا تھا جس کی یاد اُنھیں عُمر بھر ستاتی رہی۔ اب کی بار وہ دہلی آئے تو غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے تھے۔ یہی دو غم میرؔ کی شاعری کا سانحہ بن گئے۔ یہ وہ حقیقتیں تھیں جن کو میرؔ نے فن کارانہ انداز میں پیش کر کے امتیازی خصوصیت حاصل کر لی۔ میرؔ دہلی آکر اپنے سوتیلے بھائی کے ماموں سراج الدین خان آرزوؔ کے ہاں ٹھہرے۔ وہ خود اچھے شاعر تھے۔ میرؔ نے اُن کے فیض سے بہت کچھ حاصل کیا۔ میرؔ کو یہاں بھی زیادہ دیر فراغت حاصل نہ ہو سکی۔ میرؔ ''ذکرِ میرؔ'' میں لکھتے ہیں کہ آرزوؔ بڑے بھلے آدمی تھے مگر جیسے ہی سوتیلے بھائی نے خط لکھا کہ میرؔ فتنۂ بے روزگار ہے۔ اِس کی ہرگز تربیت نہ کی جائے تو وہ بھانجے کی بات ٹال نہ سکے اور میرؔ پر طرح طرح کے ظُلم ڈھانے لگے۔ اِس دوران میں میرؔ پر جنوں کی حالت طاری ہوگئی۔ اُنھیں چاند میں کوئی حسین چہرہ نظر آنے لگا۔ اُن پر ہر وقت جنون کی سی کیفیت طاری رہتی۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وہ یہاں بھی کچھ زیادہ خوش نہ رہ سکے۔

اِن تمام واقعات نے اور ان تمام مصائب نے اس طرح اثر کیا کہ اُن کی آہیں اثر کرنے لگیں ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ دُرانی نے دہلی پر حملہ کیا اور جو کچھ کسر اُس سے رہ گئی احمد شاہ ابدالی نے پُوری کردی۔ دہلی تباہ ہوگئی۔

بقول میرؔ دہلی کی حالت اُس بیوہ کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں تھی مگر بیواؤں سے کہیں بدتر زندگی بسر کر رہی تھی۔ ایک ایک کر کے تمام شاعر دہلی چھوڑ رہے تھے۔ میرؔ کو بھی دہلی چھوڑنا پڑی۔ میرؔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں کافی عزت ملی۔ بات کم کرتے تھے اور آہستہ آہستہ۔ مزاج میں قناعت اور خودداری ضرورت سے زیادہ تھی۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ وہ کہیں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پائے۔ اس بات کا اُنھیں شدّت سے احساس بھی تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

حالت تو یہ مُجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دِل شورشِ دردنی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے مجلسوں میں نام مرا میرؔ بے دماغ

اِس حد سے زیادہ بدمزاجی کی وجہ سے اکثر دُکھ اُٹھاتے، فاقے کرتے لیکن اپنے اس مزاج کے باعث کسی کے آگے دستِ سوال نہیں پھیلاتے۔ اکثر اہل دُنیا سے بیزار رہتے۔ آپ کا انتقال ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ہوا اور وہیں مزار بھی ہے۔

میرؔ کی مثنوی نگاری:

غزل میرؔ کی مخصوص صنف ہے اور اُس میں اُن کا رُتبہ بہت بُلند ہے۔ تغزل کو جس کامیابی اور خوش اسلوبی سے میرؔ صاحب نے نبھایا ہے وہ اُن ہی کا حصّہ ہے اور اس سبب سے اُن کی انفرادیت واہمیت قائم ودائم ہے۔ اُن کے اشعار میں حقائق، سوز وگداز، نشتریت، سلاست، روانی، شیرینی وغیرہ کی کیفیتیں پائی جاتی تھیں۔ اُن کے کلام میں سادگی اور صفائی اِتنی زیادہ ہے کہ بلا غور وفکر اشعار ذہن میں سما جاتے ہیں اور دِل میں نشتر کی طرح اُتر جاتے ہیں۔ نفسِ جذبات پر

نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام میں اُس دل کی وارداتیں ہیں، جس پر عشق کا پُورا وار ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ میؔر نے دیگر اصنافِ شاعری کو بھی برتا ہے۔

انھوں نے قصائد بھی کہے ہیں۔ لیکن وہ سوؔدا سے بہت پیچھے ہیں۔ اُس کا سبب شاید یہ رہا ہو کہ اُن پر درد اور یاس کا غلبہ ہے جو قصیدے کے لیے کار آمد نہیں۔ غزل کے بعد جس صنف میں میؔر کو کامیاب کہا جاسکتا ہے وہ مثنوی نگاری ہے۔ مثنوی نِگاری میں میؔر صاحب کو خاصی کامیابی ہوئی جس کی مثال ''جھوٹ''، ''گھر کا حال''، ''در ہجو خانہ خود'، ''جوشِ عشق'' اور ''خواب وخیال'' جیسی مثنویاں ہیں۔ وہ وارداتِ عشق نہایت عُمدہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں مگر منظر نِگاری پر قُدرت نہیں رکھتے۔ میؔر کی زبان صاف، شُستہ اور پاکیزہ ہے۔ دِل کے خیالات کو جذبے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں نہایت عُمدگی سے ادا کر دیتے ہیں اور پھر زبان میں اللہ تعالیٰ نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اس واسطے اِن کی شاعری میں دیگر شعراء کے مقابلے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ اُن کی مثنوی نگاری کی ایک مثال دیکھیے ۔

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال — پڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
طوطا، مینا تو ایک بابت ہے — پُودنا پھُدکے تو قیامت ہے
کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار — تھرتھراوے جھنجھیری سی دیوار
ہو گیا ہے جو اتفاق ایسا — شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا
ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب — اُڑ جھنجھیری کہ ساون آیا اب

میؔر بنیادی طور پر درد وغم کے شاعر ہیں اس لیے اُن کی غزلوں میں جو کیفیت اور جو فضا حاوی رہتی ہے وہی کیفیت اُن کی مثنوی نگاری کا بھی خاصہ ہے۔ یہاں بھی اُن کے اشعار پُر درد اور پُر اثر ہیں ۔

بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں — قدر کیا گھر کی جب کہ میں ہی نہ ہوں
گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور — ہے خرابی سے شہر میں مشہور!

جس سے پوچھو اسے بتادے شتاب ساری بستی میں ہے یہی تو خراب
ایک چھپّر ہے شہر دلّی کا جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا

ان تمام باتوں کے باوجود میرؔ اچھی مثنویاں لکھنے کے باوصف مثنوی نگاری میں میر حسن تک نہیں پہنچ سکے۔

میرؔ کے کلام کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے۔ایک دیوان فارسی اور چھ اُردوٗ کے دیوان ہیں۔ بہت سی مثنویاں ہیں۔ ایک رسالہ فیضِ میرؔ، ایک تذکرہ ''نکات الشعرا'' اور ''ذکرِ میرؔ'' (خودنوشت سوانحِ عُمری) اُن کی یادگاریں ہیں۔ اُردوٗ دیوان میں غزلوں کے علاوہ رُباعی، مخمس، ترجیع بند، مسدّس، مرثیے وغیرہ سب کچھ ہے۔ میرؔ صاحب کی شاعری اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اُردوٗ زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بل کہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ الفاظ کا صحیح استعمال کہ جس طرح کی بات یا مضمون ہوگا اُسی طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جس سے دِل کشی اور تاثیر بڑھ جاتی ہے۔

5.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

۱۔ میرؔ کا پورا نام کیا ہے؟

۲۔ میرؔ کس سن میں اور کہاں پیدا ہوئے؟

۳۔ میرؔ کے سوتیلے ماموں کا کیا نام تھا؟

۴۔ میرؔ نے ابتدا میں کس شاعر سے فیض حاصل کِیا؟

۵۔ غزل کے بعد جس صنفِ ادب میں میرؔ کو کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ وہ کون سی صنفِ ادب ہے؟

۶۔ میرؔ کی چند ہجویہ مثنویوں کے نام کیا ہیں؟

۷۔ میرؔ کے کُل کتنے دیوان ہیں اور اُن میں فارسی کے کتنے ہیں اور اُردو کے کتنے؟

۸۔ میرؔ کی خودنوشت سوانح عمری کا نام کیا ہے؟

۹۔ میرؔ کے تذکرے کا نام کیا ہے؟

۱۰۔ میرؔ کی شاعری میں کِس جذبے کی زیادہ کارفرمائی نظر آتی ہے؟

اکائی 6:　　مثنوی کی تعریف اور خصوصیات

6.1　تمہید

6.2　مثنوی کی تعریف اور خصوصیات

6.3　نمونہ برائے امتحانی سوالات

6.4　امدادی کتب

6.1　تمہید

مثنوی اس طویل نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی قصہ یا کوئی واقعہ تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ چونکہ مثنوی میں لمبی سے لمبی بات کو تفصیل سے بیان کرنے اور ہر طرح کا مضمون ادا کرنے کی گنجائش ہے اس لیے حالی نے اس صنف کو سب سے زیادہ کارآمد بتایا ہے اور اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اردو شاعری میں مثنوی کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی توجہ کی یہ مستحق تھی۔

مثنوی ایک بیانیہ صنف ہے۔ اس میں خیال مربوط رہتا ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے اور قصہ بتدریج آگے بڑھتا ہے گویا مثنوی ایک ایسی صنف شاعری ہے جس میں ایک طویل، مربوط اور مکمل شعری کارنامہ وجود میں آنے کے امکانات موجود ہیں۔ یہاں ایک بات کا واضح کردینا ضروری ہے کہ غزل کا شعر کم فرصتی میں بھی کہا جاسکتا ہے لیکن مثنوی کا معاملہ مختلف ہے۔ اس کے لیے کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہلی تو یہ کہ قلم اٹھانے سے پہلے مکمل مثنوی کا خاکہ ذہن میں تیار کرلیا جائے۔ اس کے بعد مستقل مزاجی کے ساتھ اسے تکمیل کو پہنچایا جائے۔ واقعات کی ترتیب و تعمیر ایسی ہو کہ قصہ مربوط رہے۔ زبان ایسی ہو کہ پڑھنے والا اس

میں الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ اس کی توجہ واقعات پر مرکوز رہے۔ اگر مثنوی میں کچھ ایسے اشعار موجود ہوں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیں تو اسے مثنوی کا عیب سمجھنا چاہیے۔

واقعہ نگاری مثنوی کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ یہ واقعات فطری بھی ہو سکتے ہیں اور فوق فطری بھی۔ مثنوی میں رزم و بزم، اخلاق و فلسفہ، ہر موضوع کی گنجائش ہے۔ عشقیہ قصے بھی مثنوی کا خاص موضوع رہے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مثنوی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

مثنوی کا فن توضیحی فن ہے۔ یہاں غزل کی طرح رمز و کنایے میں بات نہیں کی جا سکتی۔ واقعات کا بیان ہوتا ہے اس لیے بات کو صراحت کے ساتھ کہا جاتا ہے تاکہ واقعات آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہوتے جائیں۔

6.2 مثنوی کی تعریف اور خصوصیات

مثنوی کی تعریف: مثنوی فارسی اور اُردو میں بڑی اہم صنفِ سخن رہی ہے۔ یہ وہ صنفِ سخن شاعری ہے جس میں ایک طویل داستان کو مُسلسل نظم میں بیان کیا جاتا ہے۔ مثنوی میں ہر شعر کے قافیے دوسرے شعر کے قافیوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ مثنوی کے لیے سات اوزان مقرر ہیں۔ اِس صنفِ سخن کا آغاز توحید و مناجات سے ہوتا ہے، پھر مدح حاکم، بعد میں تعریفِ شعر و سخن اور سببِ تالیف اور پھر اصل قِصّہ بیان کیا جاتا ہے۔

مثنوی ایک ایسی صنف ہے جس میں جن و پریوں کی کہانیاں، عجیب و غریب واقعات، عام اِنسانوں کے عشق و محبت کی داستانیں، خوشیوں، غموں، شادی اور موت کی رسوم، اخلاقی قِصّوں، تصوف کے مسائل، مذہبی تعلیم، میدانِ جنگ اور بزمِ طرب کی دلاویزیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ اِس میں غزل کی سادگی قصیدے کی شان اور مرثیے کا غم سب کچھ ہی ہوتا ہے۔ کہنے کو تو مثنویوں میں عام طور سے ایک من گھڑت کہانی یا خیالی قِصّہ اور اکثر اوقات خلافِ قیاس اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اِس میں بھی واقعات کو جوڑنے، اِن کو مربوط کرنے اور واقعات کے ارتقا میں حیات کے بہت سے حسین اور جان دار پہلو آتے جاتے ہیں۔ مثنوی میں ڈرامائی مواقع بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں قصیدے کا طمطراق، غزل کی

گھلاوٹ، طربیہ شاعری کی شگفتگی، حزنیہ شاعری کی اثر اندازی، غرض سب کچھ اس میں سما سکتا ہے۔

مثنوی کی کامیابی کا راز بہت حد تک اس کے واقعات کی ترتیب و تسلسل اور مثنوی کے اسلوب اور طرزِ بیان میں مُضمر ہوتا ہے۔ اس صنف میں شعری نزاکتوں اور ادبی لطافتوں کو استعمال کرنے کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن اس کا کمال تسلسل اور ربط ہی ہے۔ شاعر کی توجہ واقعات کے ارتقا، ترتیب اور ربط میں زیادہ مصروف رہتی ہے۔ مثنوی اقسامِ شاعری میں سب سے زیادہ ہمہ گیر ہے۔ اس میں تمام قسم کے انواع بڑی خوبی سے ادا کیے جاسکتے ہیں۔ جذباتِ انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری گویا تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے بہتر کوئی صنف نہیں ہے۔

مثنوی میں چوں کہ واقعات کا بیان ہوتا ہے اس لیے کردار نگاری بھی اس کا ایک لازمی جزو ہے اور کردار نگاری کے لیے ضروری ہے کہ فن کار انسانی نفسیات اور اس کی پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف ہو۔ مختلف کرداروں کی زبان بھی الگ الگ ہوتی ہے اس لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کس موقع پر کس کردار کی زبان سے کس طرح کے الفاظ ادا ہونے چاہیے۔ گویا لازمی ہے کہ مثنوی نگار ایک اچھا مکالمہ نویس بھی ہو۔

مثنوی میں عموماً ایسے موقعے بھی آتے ہیں جہاں ڈرامائی عنصر ناگریز ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ مثنوی کا فن خاصا پیچیدہ فن ہے۔ اس کے لیے صرف محنت اور منصوبہ بندی ہی کافی نہیں بلکہ وسیع مطالعہ اور گہرا مشاہدہ بھی بے حد ضروری ہے۔ مثنوی میں ردیف و قافیے کی پابندی اس طرح نہیں ہوتی جس طرح غزل اور قصیدے میں ہوتی ہے بلکہ مثنوی کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ردیف کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

ابتدا میں رزمیہ اور بزمیہ مثنوی کے لیے الگ الگ بحریں مقرر تھیں لیکن آگے چل کر یہ پابندی باقی نہ رہی اور مثنوی نگار کو واقعات کے بیان کے لیے آزادی حاصل ہوگئی اور یہ ضروری بھی تھا، کیوں کہ مثنوی میں واقعات ہی کو اہمیت حاصل ہے۔

تقریباً ہر زبان کے ابتدائی ادب کی ایک خصوصیت مشترک رہی ہے اور بولیاں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں

کہ اہم واقعات، قابل ذکر مہمات اور قومی بہادروں کے کارنامے سادہ زبان میں طویل نظموں کی شکل میں پیش کیے گئے۔ اس طرح صنف مثنوی کی داغ بیل پڑی۔ ہماری زبان کا معاملہ اس سے ذرا مختلف ہے۔

ہمارے ابتدائی ادب کا بیشتر حصہ مذہبی نوعیت کا ہے. ہمارے صوفیا اور بزرگان دیں کی زبان فارسی تھی لیکن اشاعت اسلام کے لیے انھیں عام بول چال کی زبان کا استعمال ضروری معلوم ہوا اور بزرگوں نے اس عوامی بولی کا سہارا لیا جو ترقی کر کے اردو زبان کہلائی۔ انہوں نے پند و نصائح اور متصوفانہ خیالات کو مثنویوں کی شکل میں پیش کیا۔

6.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ مثنوی کی تعریف کیا ہے؟

2۔ مثنوی کی تعریف کرتے ہوئے، مثنوی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ مثنوی کے اجزائے ترکیبی کون کون سے ہیں اور وضاحت بھی کیجیے۔

4۔ مثنوی کی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔

6.4 امدادی کتب

1. اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی ۱۱ سی، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱
2. اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
3. مثنوی سحر البیان، از میر حسن، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو
4. مثنوی گلزار نسیم، دیا شنکر نسیم لکھنوی، از رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
5. اردو مثنوی کا ارتقا، جدید اڈیشن، از پروفیسر عبد القادر سروری، ناشر ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ

اکائی 7: مثنوی ''سحرالبیان'' کا تنقیدی جائزہ

7.1 تمہید
7.2 مثنوی ''سحرالبیان'' کا تنقیدی جائزہ
7.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات
7.4 امدادی کتب

7.1 تمہید

اُردو کی معروف کلاسیکی مثنوی 'سحرالبیان' (۱۷۸۵۔۱۷۸٦ء) کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا ڈرامائی جوہر ہے کہ جس سے ہم شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی منظوم صورت اگر ہندوستانی جمالیات کے قدیم علماء کے سامنے رکھی جاتی تو وہ اسے ایک خوبصورت منظوم تمثیل یا ڈراما قرار دیتے ہیں۔ کرداروں کے عمل سے ایک ڈراما جنم لیتا ہے ایسا ڈراما جوان کے عمل اور ردِ عمل (Karya) سے ارتقا پذیر ہوتا ہے اور اختتام پر جمالیاتی انبساط اور آسودگی بخشتا ہے۔ میر حسن نے ایک کہانی مرتب کی ہے۔ اس کے واقعات مرتب کیے ہیں۔ ایک خاص عمل کو منتخب کیا ہے کہ جس سے دوسرے عوامل وابستہ ہیں، اسی سے وحدتِ عمل پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستانی جمالیات کے مطابق ہیرو اور ہیروئن کے عمل میں زندگی اور تحرک پیدا کرنے کے لیے ایک یا ایک سے زیادہ ضمنی کرداروں کا ایسا عمل شروع ہوتا ہے کہ جس سے بنیادی کہانی کا ارتقا تیزی سے ہوتا ہے۔ نجم النساء کے عمل سے شہزادہ بے نظیر اور بدر منیر کی کہانی میں تحرک پیدا ہوتا ہے جس کا اثر کہانی کے ارتقا پر ہوتا ہے اور تمثیل ایک جمالیاتی تاثر دے کر اختتام پذیر

ہوتی ہے۔ ایسے ذیلی کرداروں کو ہندوستانی جمالیات میں 'پراسنگیکا' (Prasangika) کہا گیا ہے یعنی وہ کردار جو حد درجہ مددگار ہو، مرکزی کردار کے غم کو اپنا غم بنا لے اور اسے نشاطِ غم میں تبدیل کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے کرداروں کے عمل سے تحرک پیدا ہوتا ہے اور مرکزی عمل یا مرکزی کردار کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ مثنوی سحرالبیان میں نجم النسا 'پراسنگیکا' بھی ہے اور مدد کرتے ہوئے خود ایک رومانی فسانے کا مرکزی کردار بن جاتی ہے، مرکزی کہانی کے ساتھ ایک چھوٹی سی کہانی بھی وجود میں آجاتی ہے۔ نجم النسا اور فیروز شاہ کی ایسی چھوٹی کہانی قدیم ڈراموں، فسانوں اور تمثیلوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ہندوستانی جمالیات میں اسے 'پاتکا' (Patka) کہتے ہیں۔ یعنی ایک دوسری کہانی چھوٹی سی! کوئی ضروری نہیں کہ اس چھوٹی کہانی کا بھی باضابطہ ارتقا ہو، ارتقا کے بغیر کرداروں کا عمل توجہ طلب بن جاتا ہے، ایسے مختصر عمل کو سمجھنے کے لیے ہندوستانی جمالیات میں 'پراکاری' (Prakari) کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے یعنی صرف ایک واقعہ ارتقا کے بغیر!

7.2 مثنوی کی تعریف اور خصوصیات

مثنوی ''سحرالبیان'' ایک عشقیہ داستان ہے جو میر حسن کی جدتِ طبع کا نتیجا ہے۔ ۱۷۸۵ء میں میر حسن نے نواب آصف الدولہ کے عہد میں اس کو لکھا۔ اُرد و ادب کی اس شاہکار نظم نے میر حسن کو زندہ جاوید بنا دیا۔ محمد حسین آزاد نے بہت خوب لکھا ہے کہ اُرد و میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئی ہیں مگر فقط دو نسخے ایسے ہیں جن کو قبولِ عام کا شرف حاصل ہوا ہے اور اُن میں سے سحرالبیان کا مقام بُلند ہے۔

میر حسن نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ نوابوں اور روساء کی دُنیا تھی جو شاعروں اور ادیبوں کی قدر اور سرپرستی کرتے تھے مگر اِس دور کا نظامِ حکومت اندر سے کمزور ہو چکا تھا۔ ایک طرف جاگیرداری نظام ختم ہو رہا تھا اور دوسری طرف شعراء اور ادیب یکجا ہو رہے تھے۔

علم و ادب کے شباب کا زمانہ تھا۔ میر حسن نے فیض آباد کی چہل پہل اور لکھنؤ کی رونق بھی دیکھی تھی جہاں پر دِن روز عید اور ہر شب، شبِ برات تھی۔ لکھنؤ کو دُلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ جاگیردارانہ نظام کی خوبیوں، خامیوں کو میر حسن نے اپنی

آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کو میر حسؔن نے اپنی مثنوی میں سمیٹ لیا ہے۔''سحرالبیان'' کی تمام فضا دیدہ ہے، شنیدہ نہیں ہے۔''سحرالبیان'' کے پڑھنے سے لکھنؤ کے معاشرے کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

سحرالبیان کا پلاٹ:

مثنوی''سحرالبیان'' کا پلاٹ بالکل نیا نہیں ہے۔ اس طرح کے قصّے جن میں مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار ہو، ہمیں پُرانی داستانوں میں مِل جاتے ہیں مگر اِس انداز میں کہیں نہیں ملتا۔ اور پھر میر حسؔن نے مثنوی کے پلاٹ کو جس خوبی اور انداز کے ساتھ مکمل طور پر پیش کیا ہے، وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور پھر مثنوی کی کامیابی کا دار و مدار محض پلاٹ پر نہیں ہے بل کہ اس کی زبان و بیان اور انداز و اسلوب میں مُضمر ہے۔

مثنوی کے رکردار:

پلاٹ اور رکردار کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اِن کو ہم علاحدہ نہیں کر سکتے۔ قِصّہ کو بغیر پلاٹ کے بڑھایا جاسکتا ہے مگر بغیر رکردار کے قِصّہ کی زندگی باقی نہیں رہتی۔

''سحرالبیان'' کے اہم رکرداروں میں بےنظیر، بدرمنیر، نجم النسا، ماہ رخ اور فیروز شاہ وغیرہ ہیں۔ اِن کے علاوہ خواصیں، ملازمین، دیو، پریاں بھی ہیں۔ اِن میں سب سے زیادہ اہم رکردار بےنظیر، بدرمنیر اور نجم اُلنسا ہیں جن کے رگرد داستان گھومتی ہے۔ بےنظیر کے رکردار میں نسوانیت زیادہ اور مردانگی کم ہے۔ وہ بے جان سا لگتا ہے۔ جاگیرداروں کے دور کا ایک بگڑا ہوا شاہزادہ ہے جو عیش و عشرت میں راتیں تو گزار سکتا ہے لیکن عملی میدان میں اُسے ہر وقت دوسروں کے سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ماہ رخ کی قید میں اُس کے عمل سے کبھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس قید سے رہائی کا خواہش مند ہے۔ اُڑن گھوڑا مِل جانے کے بعد بھی وہ بےبس اِنسان کی طرح واپس آجاتا ہے۔ اُس کے عمل اور مزاج دونوں سے نسوانیت کی جھلک ملتی ہے۔

بدرمنیر کا رکردار بھی کچھ زیادہ جاندار نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکتی۔ بےنظیر سے

پہلی ہی ملاقات میں وہ اپنے جذبات اُس پر واضح کر دیتی ہے۔ اُس کی جدائی میں سوائے غمگین رہنے کے اُس سے کچھ نہیں بن پاتا اور اُس کے دوبارہ آنے پر بے نظیر کو مُلاقات کی خوشی میں وہ اپنا سب کچھ اُسے سونپ دیتی ہے۔

نجم اُلنسا کا کردار البتہ بہت جاندار ہے۔ نجم اُلنسا، بدر منیر کے والد کے وزیر کی بیٹی ہے اور بدر منیر کی سہیلی ہے۔ وہ بہت حسین اور مددگار سہیلی ہے۔ وہ صرف وزیرزادی ہی نہیں بل کہ ایک سچی غم گسار اور مصیبت میں ساتھ دینے والی ہے۔ وہ وفادار ہے، شگفتہ مزاج ہے، دردمند ہے اور جذبہ اور قُربانی کی صفات کی حامل ہے۔ نجم اُلنسا میں عمل کی صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ دردمندی نے اُس کے اندر ایک جذبہ پیدا کیا اور یہ جذبہ اُس کو میدانِ عمل میں کودنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات پر بدر منیر کے برعکس قابو رکھ سکتی ہے۔ وہ جوں کے شہزادہ فیروز شاہ کو تب تک اپنا ہم راز نہیں بناتی جب تک اُس کو یقین نہیں ہو جاتا کہ اُس کی محبت سچی ہے اور ساتھ ہی وہ اپنا مدعا حاصل کرنے کے لیے اپنی محبت کو مشروط کر دیتی ہے۔

اِن کے علاوہ بھی جو کردار ہیں وہ مثنوی کو رونق تو بخشتے ہیں مگر اُن میں وہ زندگی اور گرمی نہیں ہے جو قصّے کی جان بن سکیں۔ اُن کی حیثیت ایک کٹھ پتلی کی سی ہے جنھیں جدھر چاہا اُدھر پہنچا دیا۔ ہاں ماہ رخ اور فیروز شاہ کا کردار کچھ جاندار ہے۔ مگر اُس میں بھی وہ عزم و استقلال نہیں ہے جو مثنوی کے دوسرے اہم کرداروں میں ہے۔

منظر نگاری:

منظر نگاری کا مسئلہ بہت اہم اور نازک ہوتا ہے۔ دراصل جب شاعر کسی کردار کے نازک خدوخال کو بے نقاب نہیں کر سکتا تو وہ منظر نگاری کا سہارا لیتا ہے۔ اس طرح منظر نگاری کی حیثیت ایک منفی پہلو کی سی ہوتی ہے۔ اثباتی پہلو تو صرف کرداروں کا ہوتا ہے۔ البتہ قصّے کے پس منظر میں منظر نگاری ضروری ہے اور کچھ اِس طرح کہ کہانی کے تسلسل میں ذرا برابر کمی نہ آئے اور کرداروں کے خدوخال پر پردہ نہ پڑ پائے۔ میر حسؔن کا یہ پہلو بہت دِل چسپ ہے۔ وہ اپنا باغیچہ پھولوں سے تیار کرتے ہیں۔ جب کہ دوسرے الفاظ میں بیل بوٹے بنا کر باغ کی رونق بڑھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ خوشبو بھی دیں۔ میر حسن نے مثنوی ''سحر البیان'' میں منظر نگاری کی ایسی مثالیں پیش کی ہیں جو میر انیؔس کے

علاوہ اُردُ وشاعری میں اور کہیں نہیں ملتیں۔

جذبات نگاری:

جذبات نگاری میں شاعر کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے اور اُس کی ذراسی لغزش پورے قصّے کو ڈُبو سکتی ہے۔ قصّے میں بہت زیادہ کردار ہوتے ہیں جن کا رُتبہ اور منصب مختلف ہوتا ہے۔ شاعر کو تمام کے جذبات سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ باپ کا بیٹے کے غم میں کیا حال ہوتا ہے۔ عاشق کا محبوبہ کے غم میں کیا حال ہوتا ہے۔ بادشاہ سے عقیدت اور وزراء کا ہمدردانہ اظہار وغیرہ۔ میرحسؔن نے ہر جگہ جذبات نگاری میں اپنی قابلیت کا سکّہ جما دیا ہے۔

زبان واسلوب:

میرحسؔن کی زندگی کا کچھ حصّہ دِلی اور کچھ حِصّہ لکھنؤ میں گذرا۔ اُن کی طبعیت نے اِن دونوں دبستانوں سے فیض اُٹھایا۔ مگر زبان وبیان کے معاملے میں اُنھوں نے دہلوی رنگِ سخن اپنایا۔ اُن کے یہاں نرم وملائم الفاظ، شگفتہ بیانی اور دِل کش محاورے، پاکیزہ اور صاف ہیں۔ جو معیارِ وضاحت کے عین موافق ہیں۔ میرحسؔن نے روزمرّہ تشبیہات، استعارات اور محاورات کا دِل چسپ استعمال کیا ہے۔ کلام میں غیر فصیح الفاظ بہت کم ملتے ہیں۔ میرحسؔن کی مثنوی ''سحر البیان'' کی کامیابی کا راز بہت حد تک اِس کی زبان وبیان وانداز واسلوب میں مُضمر ہے۔

7.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ مثنوی ''سحرالبیان'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

2۔ مثنوی ''سحرالبیان'' کی زبان واسلوب کی نوعیت بیان کیجیے

3۔ مثنوی ''سحرالبیان'' کی کردار نگاری پر بات کیجیے

4۔ مثنوی ''سحرالبیان'' کی منظر نگاری بیان کیجیے

5۔ مثنوی ''سحرالبیان'' میں لکھنو کی تہذیب ومعاشرت کی عکاسی کیجیے۔

7.4 امدادی کتب

1. اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی II سی، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱
2. اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
3. مثنوی سحر البیان، از میر حسن، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو
4. مثنوی گلزار نسیم، دیا شنکر نسیم لکھنوی، از رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
5. اردو مثنوی کا ارتقا، جدید اڈیشن، از پروفیسر عبدالقادر سروری، ناشر ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

اکائی 8:　　مثنوی ''گلزارنسیم'' کا تنقیدی جائزہ

8.1　تمہید

8.2　مثنوی ''گلزارنسیم'' کا تنقیدی جائزہ

8.3　نمونہ برائے امتحانی سوالات

8.4　امدادی کتب

8.1　تمہید

مثنوی ''گلزارنسیم'' (۳۹-۱۸۳۸ء) اردو کی ممتاز کلاسیکی مثنویوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ 'آبِ حیات' کی تلاش کی طرح 'گل بکاؤلی' کی تلاش بھی ایک دلچسپ فسانہ بنی رہی ہے۔ ممکن ہے آبِ حیات کی طرح اس کی جڑیں بھی لوک فسانوں حکایتوں میں جذب ہوں۔ پہلا قصہ فارسی نثر میں ملتا ہے، عزت اللہ بنگالی نے یہ کہانی لکھی تھی، منشی نہال چند لاہوری نے گل کرسٹ کی فرمائش پر ۱۷۲۲ء میں اس قصے کو اُردو نثر کا جامہ پہنایا تھا۔

8.2　مثنوی ''گلزارنسیم'' کا تنقیدی جائزہ

اردو میں دو ہی مثنویوں نے بے پناہ شہرت حاصل کی ہے ایک میر حسن کی مثنوی ''سحرالبیان'' نے دوسری پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارنسیم۔ ان میں سے اگر ایک فتنہ ہے تو دوسری ''عطر فتنہ' دونوں نے اردو شاعری کی دنیا میں قیامت برپا کردی ہے۔ ''سحرالبیان'' میں سادگی کا حسن ہے اور ''گلزارنسیم'' میں پرکاری کا جادو ہے، غرضیکہ دونوں

میں ساحری اور عشوہ طرازی موجود ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں،

''ہمارے ملکِ سخن میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنہوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک ''سحرالبیان'' اور دوسرے ''گلزارنسیم'' اور تعجب یہ ہے کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں۔''

مثنوی ''گلزارنسیم'' پنڈت دیاشنکرنسیم کی وہ مثنوی ہے جس نے انہیں حیات جاوید عطا کی اور یہی وہ مثنوی ہے جسے لکھنو کے دبستان شاعری کی پہلی طویل نظم کا شرف حاصل ہے۔ نسیم حیدرعلی آتش کے شاگرد تھے۔ اور اس مثنوی کی تصنیف کے دوران شاگرد کوقدم قدم پر استاد کی رہنمائی حاصل رہی آتش کی ہدایت پر ہی نسیم نے مثنوی کومختصر کر کے نئے سرے سے لکھا اور ایجاز واختصار کا معجزہ کہلایا۔ بقول فرمان فتح پوری کہ:

''اس میں کردار نگاری، جذبات نگاری اور تسلسل بیان کی کم وبیش وہ سبھی خصوصیات ہیں جو کہ ایک افسانوی مثنوی کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہیں لیکن اس کی دلکشی کا راز دراصل اس کی رنگین بیانی، معنی آفرینی، کنایاتی اسلوب، لفظی صنائع اور ایجاز نویسی میں پوشیدہ ہے ان اوصاف میں بھی اختصار ایجاز کا وصف امتیازی نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔''

پلاٹ:۔

''گلزارنسیم'' کے پلاٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بادشاہ کا نام زین الملوک تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے کچھ عرصہ بعد پانچواں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام تاج الملوک تھا۔ اس بیٹے کے بارے میں نجومیوں نے پیش گوئی کی کہ اگر بادشاہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ بینائی سے محروم ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ طبیبوں نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ ایک پھول ہے ''گل بکاولی'' اُس سے اس کی بینائی واپس آسکتی ہے۔ بس اس طرح سارے قصے کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔

گلزارنسیم کی ایک خصوصیت اس کے پلاٹ کی پیچیدگی ہے یہ صرف تاج الملوک اور بکاولی کی کہانی نہیں نہ

صرف ایک پھول حاصل کرنے کی کہانی ہے بلکہ اس میں کئی کہانیاں گتھ گئی ہیں۔ تاج الملوک کی شادی کے ساتھ ہی قصہ ختم ہو جانا چاہئے تھا مگر راجہ اندر اور چترا وت اس کہانی کو آگے لے جاتے ہیں دراصل یہ کہانی ایک استعارہ ہے کہ مقصد کے حصول میں کتنی دشواریاں ہوتی ہیں کس طرح آگ کے دریا میں گزرنا پڑتا ہے۔ پھر مقصد حاصل ہونے کے بعد ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مگر ارادہ پختہ اور کوشش مستحکم ہو تو پھر ہاتھ آجاتا ہے۔

معاشرت کی تصویر کشی:۔

اگرچہ ''گلزارِ نسیم'' کا پلاٹ مکمل طور پر فرضی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعر اپنے دور سے مواد حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''گلزارِ نسیم'' میں نوابین اودھ کے عہد کی تہذیب نظر آتی ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے نواب غازی الدین حیدر، نواب نصیر الدین حیدر، نواب محمد علی شاہ، نواب امجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس لئے اس عہد میں لکھنو میں جو رواج تھے ان کی جھلک ''گلزارِ نسیم'' میں نظر آتی ہے۔ جب تاج الملوک اور بکاولی کی شادی ہوئی تو کچھ رسمیں ادا کی گئیں جن کا ذکر نسیم ان اشعار میں کرتے ہیں:

گل سے خوانوں میں زردہ لایا
ان غنچہ دہانور کو کھلایا
جب عقد کی انکے ساعت آئی
دو رشتوں میں ایک گرہ لگائی
حق پاکے جو رکھتی تھیں قدامت
بول اٹھیں مبارک و سلامت

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنو کے نوابی دور میں گانا، ناچ کے علاوہ حقہ، پان، کھانے کا رواج تھا۔ اور بھی بہت سے رواج اور رسم مثنوی ''گلزارِ نسیم'' میں ملتے ہیں۔

مرصع کاری، بندش الفاظ:۔

مرصع کاری میں ''گلزارِ نسیم'' اپنی مثال آپ ہے اس کے لکھنے والے پنڈت دیا شنکر نسیم، خواجہ حیدر علی آتش کے

شاگرد تھے۔اور خود آتش کے خیال میں شاعری مرصع ساز کا کام ہے چنانچہ بندش الفاظ نگوں کے جڑنے کی مثل ہیں۔ دیا شنکر نسیم نے بھی بندش الفاظ کے معاملے میں اپنے استاد جیسی فنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ دیا شنکر نسیم کی اس مثنوی میں اسی مرصع سازی کے نمونے جگہ جگہ بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار دیکھیں:

عریانی کے ننگ سے لے جائیں
ستار کی سب قسمیں کھائیں
ہم بستر آدمی پری تھی
سائے کی بغل میں چاندنی تھی

منظر نگاری:۔

دیا شنکر نسیم کو منظر نگاری پر پورا عبور حاصل ہے لیکن مثنوی کو مختصر کرنے کے سلسلے میں بعض جگہوں پر اس کی کمی نظر آنے لگتی ہے یقینی طور پر اگر وہ اپنی مثنوی کو پوری طوالت کے ساتھ پیش کرتے تو ایسا نہ ہوتا۔اس کے باوجود ''گلزار نسیم'' میں عمدہ منظر نگاری کے نمونے موجود ہیں یہ نمونے مناظر میں بھی ہیں اور کیفیات میں بھی، تاج الملوک کا گزر ایک ہولناک دشت میں ہوتا ہے دکھانا یہ ہے کہ ایک صحرا ہے بے برگ وگیاہ، سبع لق ودق جہاں کبھی کسی جاندار کا گزر نہیں ہوا چاروں طرف ایک ہو کا عالم طاری ہے اس بیان کے ساتھ ساتھ تناسبِ لفظی موجود ہے اس میں عام نگاہیں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور عکاسی ومصوری کا جو کمال اس میں صرف کیا گیا ہے بادی النظر میں معلوم نہیں ہوتا۔

اک جنگل میں جا پڑا جہاں گرد
صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سائے کو پتا نہ تھا شجر کا
عنقا تھا نام جانور کا

شب کو جنگل میں سانپوں کے اوس چاٹنے کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں

لہرا لہرا کے اوس چاٹی
بن میں کالوں نے رات کاٹی

راجہ جب لونڈیوں سے سوال کرتا ہے،

پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے
شہزادی بکاؤلی کدھر ہے

تو لونڈیوں کی طرف سے مناسب جواب نہ سوجھنے پر کیا کیفیت ہوئی اس کا منظر ملاحظہ ہو:

آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
منہ پھیر کے ایک مسکرائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک
ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ منظر وہ ہے جب تاج الملوک پریوں کے کپڑے چرا لیتا ہے اور وہ شرمائی شرمائی بدن کو چراتی آگے بڑھتی ہیں، یہ منظر دیکھیں:

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں
باہر بصد آب و تاب آئیں
پوشاک دھری ہوئی نہ پائی
جانا کہ حریف نے اڑائی
جھک جھک کے بدن چراتی آئیں
رک رک کے قدم اٹھاتی آئیں

کیفیت کی منظر نگاری دیکھیں بکاولی کی فراق میں حالت یوں بیان کی ہے:

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی
کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
گرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں
آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

تاج الملوک اور گل بکاولی کا راز فاش ہونے پر ان کا کیا حال ہوتا ہے ذرا منظر دیکھیں:

دونوں کی رہی نہ جان تن میں
کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

جذبات نگاری:۔

پنڈت دیا شنکر نسیم کو جذبات نگاری میں ید طولیٰ حاصل ہے انہوں نے مختلف کرداروں کی جذبات کی عکاسی نہایت خوبی کے ساتھ کی ہے مثلاً جب بکاولی کا پھول غائب ہوتا ہے تو گھبرائے ہوئے کہتی ہے۔

گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل
گھبرائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ان اشعار میں بکاولی کی جذبات کی صحیح عکاسی کی گئی ہے بکاوٗلی کا گھبرانا اور افسوس کرنا بالکل فطری ہے اس لئے ان کے جذبات میں صداقت موجود ہے۔ اس طرح تاج الملوک اور بکاوٗلی کی شادی ہوگئی تو دونوں خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے:

راتوں کو گنتے تھے ستارے
دن گننے لگے خوشی کے مارے

اس طرح ایک اور جگہ بکاؤلی کی ماں نے جب تاج الملوک کے ساتھ اس کو اختلاط میں پایا تو اس کو سخت غصہ آیا۔اس نے اپنے غصے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

حرمت میں لگایا داغ تو نے
لٹوائی بہار باغ تو نے
تھمتا نہیں غصہ تھامنے سے
چل دور ہو میرے سامنے سے

غرضیکہ ''گلزارنسیم''میں مختلف مقامات پر جذبات نگاری کی صحیح اور حسین تصویریں ملتی ہیں:

جزئیات نگاری:۔

پنڈت دیا شنکر نسیم نے مختلف واقعات کو موقع ومحل کے اعتبار سے پیش کیا۔اس لئے اس میں بلاغت کی شان پیدا ہوگئی ہے مثلاً جب چاروں شہزادے گل بکاولی لے کر آئے تو اس کی مدد سے زین الملوک کی آنکھوں میں دوبارہ روشنی واپس آ گئی اس وقت بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے جشن آراستہ کیا۔اس واقعے کو نسیم صاحب نے ان اشعار میں بیان کیا ہے:

نور آ گیا چشم آرزو میں
آیا پھر آب رفتہ جو میں
نیچے سے پلک کے پھول اُٹھایا
اندھے نے گل آنکھوں سے لگایا

نسیم نے تاج الملوک اور زین الملوک کی ملاقات کا واقعہ مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے۔

دونوں میں ہوئیں چار آنکھیں
دولت کی کھلیں ہزار آنکھیں!

راجا نے ایک روز بکاؤلی کو اپنی محفل میں یاد کیا کیونکہ وہ ایک عرصہ سے غیر حاضر تھی نسیم اس واقعہ کو یوں بیان

کرتا ہے۔

ایک شب راجا تھا محفل آرا
یاد آئی بکاؤلی دل آرا
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے
شہزادی بکاؤلی کدھر ہے

مکالمہ نگاری:۔

''گلزارِنسیم'' میں کئی مقامات پر مکالمے بھی ملتے ہیں، اگر چہ مثنوی میں یہ ایک مشکل کام گنا جاتا ہے چلتی ہوئی کہانی کے بہاؤ میں مکالمے ٹانکنا یقینی طور پر مشکل کام ہی ہے۔لیکن دیا شنکر نسیم نے قصے میں کئی جگہ اپنے فنی کمال کا ثبوت دیتے ہوئے مکالمے پیش کیے ہیں، روح افزاء اور اس کی بہن کے مکالمے دیکھیں:

روح افزء نے کہا بہن سے
بہتر کوئی جا نہیں چمن سے
گلگشت کریں چلو کہا خیر
کیا جانے کہ ہوگی سیر میں سیر
بولی وہ یوں کہ آشنا تمہارا
پیار انہیں پیاری کا ہے پیارا

راجا اندار نے بکاؤلی کے متعلق پوچھا تو پریوں نے خاموشی اختیار کی، اصرار پر بتایا کہ:

ناتا پریوں سے اس نے توڑا
رشتہ اِک آدمی سے جوڑا
وہ سن کے خفا ہوا کہا جاؤ
جس طرح سے بیٹھی ہو اُٹھا لاؤ

مافوق الفطرت عناصر:

قدیم دور کی مثنویوں کا ایک نمایاں عنصر مافوق الفطرت عناصر کا بیان ہے۔ یہ عناصر ان مثنویوں میں خاص طور سے داخل ہو جاتے ہیں جن کے پلاٹ فرضی ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ تاریخی واقعات کے پابند نہیں ہوتے ہیں چنانچہ یہ عناصر ''سحر البیان'' میں بھی موجود ہیں اور'' گلزار نسیم'' میں بھی مگر'' گلزار نسیم'' میں یہ عناصر زیادہ تعداد میں ملتے ہیں۔ جو اسکے ساتھ محیر العقول انداز میں پیش کئے گئے ہیں یہ بیانات دلچسپ ضرور ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ مثنوی کے تصنع میں بھی اضافہ کرتے ہیں:

ڈرامائی عناصر:۔

''گلزار نسیم'' میں جابجا ڈرامائی عناصر موجود ہیں نسیم نے اس مثنوی میں مکالمے پیش کئے ہیں، جو ڈرامہ نگاری کی شان پیدا کر دیتے ہیں، جب روح افزاء رہا ہو کر آئی تو جمیلہ اور بکاؤلی اس سے ملنے گئیں اور اس کا حال پوچھا نسیم نے اس موقع پر یوں مکالمہ پیش کیا ہے۔

روح افزاء سے ہوئیں بغلگیر
صورت پوچھی کہا کہ ''تقدیر''

دوسرے مصرعے میں مکالمہ نگاری کی شان موجود ہے، تاج الملوک دلبر بیسوا سے رخصت ہو رہا ہے اس موقعہ کی تصویر نسیم نے یوں کھینچی ہے۔

یہ کہہ کے اُٹھا کہ ''لو جان''
جاتے ہیں کہا ''خدا نگہبان''

غرضیکہ ''گلزار نسیم'' میں مختلف مقامات پر ڈرامائی شان موجود ہے۔

سیرت کشی یا کردار نگاری:۔

مثنوی'' گلزار نسیم'' کے سارے کردار اگر چہ بڑی حد تک مصنوعی اور بناوٹی ہیں تاہم ان کرداروں کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں انہی خصوصیات کی بناء پر ہم ان کرداروں کو سمجھ سکتے ہیں اسی لئے ذیل کی سطروں میں کچھ کرداروں کی

خصوصیات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔

تاج الملوک:۔ مثنوی ''گلزارنسیم'' کا ہیرو تاج الملوک ہے اسی کے گرد ساری مثنوی کے واقعات گردش کرتے ہیں مگر تاج الملوک ایک بد بخت شہزادہ ہے کیونکہ اس پر جب باپ کی نظر پڑتی ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے یوں اسے ملک بدر کیا جاتا ہے۔نسیم نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی
بینائی کے چہرے پر نظر کی
مہر لب شہ ہوئی خموشی
کی نور بصر نے چشم پوشی

تاج الملوک ایک حساس اور فرض شناس انسان ہے جب بادشاہ کی بینائی جاتی رہی تو چاروں شہزادے گل بکاؤلی کے پیچھے روانہ ہوئے اس وقت تاج الملوک نے بھی اسے اپنا فرض سمجھا اور گل بکاؤلی کی تلاش میں روانہ ہوا۔تاج الملوک ایک ذہین شہزادہ تھا اس کے مقابلے میں چاروں بھائی بے وقوف اور کم عقل تھے۔تاج الملوک بہت موقع شناس تھا۔ جب تلاشِ گل بکاؤلی میں سلطنت ارم کی سرحد تک پہنچا تو سرحد کا دیو انہیں کھانے کو دوڑا۔لیکن اسی اثناء میں وہاں سے کچھ اُونٹوں کا گزر ہوا۔جن پر سامان خورد ونوش لدا ہوا تھا۔جن ان کو کچا کھانا چاہتا تھا لیکن تاج الملوک کے ذہن میں آیا کہ اس کو پکا کر کھلایا جائے تو یہ خوش ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے حلوہ پکایا۔اس واقعے کو پنڈت دیا شنکر نسیم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

حلوے کی پکا کر اک کڑھائی
شیرینی دیو کو چڑھائی!
ہر چند کہ تھا وہ دیو کڑوا
حلوے سے کیا منہ اس کا میٹھا

تاج الملوک نے موقع سے فائدہ اٹھایا، اور اس سے کہا مجھے گل بکاؤلی کی تلاش ہے۔اس کے علاوہ تاج

الملوک بہت حوصلہ منداور باہمت نوجوان تھااس نے گل بکاؤلی حاصل کرنے کے لئے بے شمار مصائب اُٹھائے مگر ہمت نہیں ہاری۔ جب اسکے بھائیوں نے دھوکے سے اس سے گل بکاؤلی چھین لی تو اس نے ہمت نہیں ہاری اور ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کیا اور آخر میں ان کو اس کا صلہ بھی ملا۔ غرضیکہ تاج الملوک میں بے پناہ خوبیاں ہیں وہ ساری مثنوی پر چھایا ہوا ہے۔ اور نمایاں کردار ہے۔

بکاولی:۔ مثنوی ''گلزارنسیم'' کی ہیروئین بکاؤلی ہے اس مثنوی میں دوسرا کردار اسی کا ہے۔ بکاؤلی ایک پری ہے اس کا حسن چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ جب تاج الملوک اس کی خواب گاہ میں پہنچا تو وہ اس کے حسن کو دیکھ کر دنگ رہ گیا نسیم یوں کہتا ہے۔

پردہ وہ حجاب سے اٹھایا
آرام میں اس پری کو پایا
بند اس کی وہ چشم نرگسی تھی
چھاتی کچھ کچھ کھلی ہوئی تھی

بکاؤلی کی خوبی یہ ہے کہ وہ ذہین وہوشیار ہے جب اس کا پھول چرایا گیا تو وہ اس کے تلاش میں گھر سے نکلی آخر کار زین الملوک کے شہر میں داخل ہوگئی بادشاہ کے پوچھنے پر اس نے خود کو غریب اور غریب زدہ بتایا اور اپنا نام فرخ اور باپ کا نام فیروز بتایا بادشاہ نے اُسے شہزادہ جان کر اپنا وزیر بنالیا۔ بکاؤلی ایک وفادار بیوی بھی ہے جب زین الملوک وطن روانہ ہو رہا تھا تو بکاؤلی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے انکے ہمراہ جانے کے لئے تیار ہوگئی انہوں نے والدین سے اجازت چاہی:

پردیسیوں سے جو کی نسبت
اب کیجئے ہنسی خوشی سے رخصت

بکاؤلی آخر وقت تک تاج الملوک کو نہیں بھولی اور آخر وقت تک تاج الملوک کا ساتھ دیا جب اس نے دھقان کے گھر میں دوبارہ جنم لیا تب اس نے تاج الملوک سے دوبارہ شادی کی۔ غرضیکہ بکاؤلی اپنے حسن، عقلمندی اور وفاداری

کی بنا پر ایک کامیاب ہیروئن نظر آتی ہے۔

دیگر کردار:۔ ''گلزارِ نسیم'' میں دیگر کردار بھی ہیں جو اہم نہیں ہیں مثلاً دلبر ایک بیسوا ہے جو لوگوں کو چوسر کھلاتی ہے اور ان کو شکست دے کر دولت کماتی ہے۔ محمودہ حمالہ دیونی کے ساتھ رہتی تھی جس کو وہ دم دلا سا دے کر اپنے ساتھ لے آتی تھی۔ اس نے حمالہ سے تاج الملوک کی سفارش کی کہ وہ بکاؤلی حاصل کرنے میں مدد کرے۔ چتراوت سنگل دیپ کے راجا کی بیٹی ہے جو تاج الملوک پر عاشق ہوگئی ہے۔ بہرام ایک وزیر زادہ ہے اور تاج الملوک کا دوست ہے۔ مگر سارے کردار ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ان پر بحث ضروری نہیں۔

اسلوب:۔

''گلزارِ نسیم''، ''سحر البیان'' کے تقریباً نصف صدی بعد لکھی گئی اس وقت تک لکھنوی معاشرہ ایک واضح شکل اختیار کر چکا تھا۔ اب زندگی کے لوازمات میں ہی نہیں بلکہ طرزِ فکر اور طرزِ گفتار میں بھی تکلف اور رنگینی آ گئی تھی۔ چنانچہ ''گلزارِ نسیم'' پڑھتے ہوئے قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی زبان اور اسلوب وہ نہیں جو نصف صدی پہلے میر حسن نے اختیار کیا تھا۔ میر حسن کے اندازِ نگارش میں دہلوی اور لکھنوی دونوں دبستانوں کی آمیزش ہے۔ جبکہ گلزارِ نسیم'' خالصتاً لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ''سحر البیان'' کے بنیادی اوصاف صفائی، زبان، لطف، محاورہ، جذبات نگاری اور منظر نگاری اور منظر کشی تھے۔ لیکن نسیم کے زمانے تک لکھنوی زندگی اس قدر رنگین ہوگئی تھی کہ لوگ تحریر اور تقریر میں تکلف کو لازمی قرار دینے لگے تھے۔ چنانچہ نسیم اور ان کے ہمعصر شعراء کا رنگینی اور مرصع کاری کی طرف غالب رجحان ہے۔ نسیم کی اپنی طبیعت میں مرصع کاری اور ذوق جمال کے عناصر موجود تھے اس کے علاوہ انہوں نے مثنوی کے لئے جس قصے کا انتخاب کیا اس کے واقعات اس قدر مربوط حیران کن اور پراسرار تھے کہ انسان کی قوت متخیلہ کو تحریک ملتی تھی۔ اس مثنوی کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

''لوگ اسے پڑھتے ہیں اور جتنی سمجھ آتی ہے اس پر لوٹے جاتے ہیں''

رعایت لفظی:۔

''گلزارِ نسیم'' کی ایک نمایاں خصوصیت رعایت لفظی ہے اس میں نسیم نے یہ کمال کیا ہے کہ یہ احساس نہیں ہوتا

کہ کوئی لفظ دوسرے لفظ سے مناسبت کی وجہ سے خواہ مخواہ بھر دیا گیا ہے۔ رعایت لفظی مشکل صنعت ہے اور اس کا نباہنا آسان نہیں، اس سلسلے میں یہ اشعار دیکھیں:

سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا
عنقا تھا نام جانور کا
ہم بستر آدمی پری تھی
سائے کی بغل میں چاندنی تھی

تشبیہ واستعارہ:۔

نسیم نے اس مثنوی میں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے یہ تشبیہیں اور استعارے نسیم کے اشعار میں کلام کا ایک جزو بن کر آتے ہیں۔ ان کے الگ وجود کا احساس نہیں ہوتا:

یوں سیج پہ آکے سوئی بے تاب
جس شکل سے آئے آنکھ میں خواب
آغوش کی موج سے وہ مضطرب کے
مچھلی سی نکل گئی تڑپ کے

صنائع وبدائع کا استعمال:۔

''گلزارِ نسیم'' میں صنائع بدائع کا استعمال بھی اچھی طرح کیا گیا ہے اس وقت کی لکھنوی شاعری میں صنائع بدائع کثرت سے استعمال ہوتے تھے اور شعراء بعض اوقات محض زور کلام کے لئے صنعتوں کا استعمال کرتے تھے ''گلزار نسیم'' کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(سوال جواب)

شاگرد تھے۔اور خود آتش کے خیال میں شاعری مرصع ساز کا کام ہے چنانچہ بندش الفاظ نگوں کے جڑے کی مثل ہیں۔دیا شنکر نسیم نے بھی بندش الفاظ کے معاملے میں اپنے استاد جیسی فنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔دیا شنکر نسیم کی اس مثنوی میں اسی مرصع سازی کے نمونے جگہ جگہ بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار دیکھیں:

عریانی کے ننگ سے لے جائیں
ستار کی سب قسمیں کھائیں
ہم بستر آدمی پری تھی
سائے کی بغل میں چاندنی تھی

منظر نگاری:۔

دیا شنکر نسیم کو منظر نگاری پر پورا عبور حاصل ہے لیکن مثنوی کو مختصر کرنے کے سلسلے میں بعض جگہوں پر اس کی کمی نظر آنے لگتی ہے یقینی طور پر اگر وہ اپنی مثنوی کو پوری طوالت کے ساتھ پیش کرتے تو ایسا نہ ہوتا۔اس کے باوجود ''گلزار نسیم'' میں عمدہ منظر نگاری کے نمونے موجود ہیں یہ نمونے مناظر میں بھی ہیں اور کیفیات میں بھی، تاج الملوک کا گزر ایک ہولناک دشت میں ہوتا ہے دکھانا یہ ہے کہ ایک صحرا ہے بے برگ وگیاہ، سبع لق ودق جہاں کبھی کسی جاندار کا گزر نہیں ہوا چاروں طرف ایک ہو کا عالم طاری ہے اس بیان کے ساتھ ساتھ تناسبِ لفظی موجود ہے اس میں عام نگاہیں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور عکاسی ومصوری کا جو کمال اس میں صرف کیا گیا ہے بادی النظر میں معلوم نہیں ہوتا۔

اک جنگل میں جا پڑا جہاں گرد
صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سائے کو پتا نہ تھا شجر کا
عنقا تھا نام جانور کا

شب کو جنگل میں سانپوں کے اوس چاٹنے کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں

8.4 امدادی کتب

1. اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی ۱۱ سی، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱
2. اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
3. مثنوی سحرالبیان، از میر حسن، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو
4. مثنوی گلزار نسیم، دیا شنکر نسیم لکھنوی، از رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
5. اردو مثنوی کا ارتقا، جدید اڈیشن، از پروفیسر عبدالقادر سروری، ناشر ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ

اکائی 9: مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کا تنقیدی جائزہ

9.1 تمہید
9.2 مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کا تنقیدی جائزہ
9.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات
9.4 امدادی کتب

9.1 تمہید

میرؔ غالباً واحد ایسا شاعر ہے کہ ناسخ ذوق اور غالب جیسے اساتذہ سے لے کر جدید دور تک کے شعرا نے رنگ میر اپنانے کی کوشش کی مگر اس میں ناکامی کا اعتراف بھی کیا۔ میر تقی میرؔ کی کلیات میں قصائد، مستزاد، مثنویاں، واسوخت، مخمس، ترجیع بند، مثلث اور مربع وقطعات سب کچھ موجود ہے۔ غزل کے چھ دیوان اور فارسی نثر میں تذکرہ ''نکات الشعراء'' کے علاوہ بہت سی مثنویاں، آپ بیتی ذکرِ میرؔ، ایک رسالہ فیضِ میرؔ وغیرہ ہیں۔ میرؔ نے اپنے پیچھے شعروادب کا ایک وسیع ذخیرہ چھوڑا ہے جس کی وجہ سے ان کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ اور روشن رہے گا۔ میرؔ واسوخت کے موجد بھی ہیں۔

9.2 مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کا تنقیدی جائزہ

''گھر کا حال'' میر کی مثنوی ہے جس میں انہوں نے اپنے گھر کو موضوع بنایا ہے اور اس کی خستہ حالت اور ناقابل رہائش ہونے پر ماتم کیا ہے۔ میرؔ کے زمانے میں ہجو لکھنے کا رواج عام تھا۔ جعفر زٹلی نے بھی ہجویں لکھی ہیں۔ سوداؔ بھی اس میدان میں پیش پیش رہے ہیں۔ میرؔ نے متعدد ہجویہ نظمیں (مثنویاں) لکھی ہیں۔ ناقدین ان ہجویوں کی تعداد

۱۸ابتاتے ہیں۔مثنوی ''گھر کا حال'' اس اعتبار سے اہم اور قابل قدر ہے کہ اس میں ایک بڑے شاعر نے اپنی معاشی پس ماندگی کو''گھر کا حال'' کی صورت میں واضح کیا ہے۔میرؔ کو اپنی عظمت اور بے مثال ادبی قد کا پورا پورا احساس تھا کہ اس بڑے فنکار کی قدر بہر حال ہونی چاہئے۔حکمران طبقہ اور سماج دونوں کو اس ضمن میں موادِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ فن اور فنکاروں کی اس قدر بے قدری کا کیا باعث ہے؟ میر کے گھر میں جھانک کر دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں مفلسی اپنے عروج پر ہے اور میر کے گھر کو اپنے چنگل میں پھنسائے ہوئے ہے۔میر کی یہ مثنوی تقریباً ۱۱۸/اشعار مفلسی کی خراب حالت کا ایک بہترین نقشہ ہے۔میرؔ جس عہد میں زندگی بسر کر رہے تھے اس عہد میں فن کاروں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی لیکن میر کو اپنی عظمت اور شعری دنیا میں اپنے قد کا اندازہ تھا اور چاہتے تھے کہ ایسے قدآور شاعروں کی قدر ہونی چاہیے۔میرؔ کو اپنے عہد کے حکمرانوں سے بھی شکوہ تھا کہ وہ کس قدر بہرہ ہیں جس کی مثال ان کی اس مثنوی میں موجود ہے۔

میر کی مثنوی سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ میر کی زندگی گھر کی خراب حالت کی مانند بکھری ہوئی تھی یہاں ہر پریشانی کو آسانی سے راستہ مل جاتا تھا۔میر کے لئے اپنے اس خراب گھر کے سوا کہیں کوئی ٹھکانا بھی نہیں کہ یہاں میر اپنی زندگی کے دن گزار سکتا۔میر نے جس فنکاری سے گھر کے حالات کو بیان کیا ہے کسی دوسرے مثنوی نگار کے لئے یہ آسان نہیں تھا۔گھر کی چھت جو شگاف حالت میں تھی، دیواریں جو کئی جگہ سے جھکی ہوئی تھی، کڑیاں جو خستہ حال ہو کر مٹی کا ڈھیر بنی جا رہی تھیں، گھر کا آنگن ہے کہ پانی کا تالاب بنا جا رہا وغیرہ کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔اصل میں میر کے گھر کا حال اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی حالت کو بخوبی پیش کرتا ہے۔خاص طور سے مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھرنے کا نقشہ کھینچا ہے۔میر نے اپنی اس مثنوی میں اپنے گھر کی جو حالت پیش کی ہے اس کو کوئی بھی نقاش تصویر کے ذریعہ آج بھی دیکھا سکتا ہے اور مثنوی پڑھتے ہی قاری کے ذہن میں فوراً گھر کی تصویر ابھر کر آجاتی ہے۔

میرؔ نے جزئیات نگاری کا بہترین مظاہرہ کیا ہے یعنی کیڑے مکوڑوں سے لے کر گھر میں رہن سہن کے سارے سامان کا ذکر کیا ہے۔گھر کے حوالے سے کوئی ایسا جز نہیں جو اس مثنوی کا حصہ نہ بنا ہو۔یعنی میر کی یہ مثنوی دکھی دل اور دلی کی آہ کا بے ساختہ اظہار ہے۔

9.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ مثنوی میرے گھر کا حال کا تنقیدی جائزہ پیش کیجئے۔

2۔ مثنوی ''میرے گھر کا حال'' کی کہانی کا تعارف بیان کیجئے۔

3۔ مثنوی ''میرے گھر کا حال'' میں دہلی کی تہذیب کی عکاسی پر روشنی ڈالیے۔

9.4 امدادی کتب

1. اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی 11 سی، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

2. اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

3. مثنوی سحر البیان، از میر حسن، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو

4. مثنوی گلزار نسیم، دیا شنکر نسیم لکھنوی، از رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

5. اردو مثنوی کا ارتقا، جدید اڈیشن، از پروفیسر عبدالقادر سروری، ناشر ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ

اکائی 10:   میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کا خلاصہ

10.1 تمہید

10.2 میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کا خلاصہ

10.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

10.4 امدادی کتب

10.1 تمہید

جب قیامت کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو بات محبوب کی جوانی تک پہنچتی ہے اور جب مثنوی کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو بات ''سحر البیان'' تک پہنچتی ہے یہ حقیقت ہے کہ جس قدر نشہ، خمار، کشش اور ساحری محبوب کی جوانی میں ہوتی ہے اسی قدر یہ خصوصیت دوسری اشیاء میں نہیں ہوتی ہیں اسی طرح سے اردو میں کافی تعداد میں مثنویاں کہی گئی ہیں مگر جو دلکشی اور ساحری مثنوی ''سحر البیان'' میں موجود ہے دوسری دوسری مثنویاں ان خوبیوں سے محروم ہیں اس لئے ہم بلا تکلف یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ سحر البیان اردو کی بہترین مثنوی ہے۔

''سحر البیان'' اردو کی ان زندہ جاوید مثنویوں میں سے ہے جو ہر زمانہ میں عوام اور خواص میں یکساں طور پر مقبول رہی ہیں اس مثنوی کی مقبولیت پر غور کیجئے تو بہت فنی محاسن ایسے نظر آتے ہیں جو دوسری مثنویوں میں نہیں ملتے ہیں۔ اس لئے ''سحر البیان'' ایک مقبول عام مثنوی ہے۔ ''سحر البیان'' کے فنی محاسن کے سلسلے میں اس کی کردار نگاری پلاٹ، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری، مرقع نگاری، منظر نگاری اور سراپا نگاری کے علاوہ ایک مربوط معاشرت کے ثقافتی کوائف کی تصویر بے حد کامیاب کھینچی گئی ہے۔

10.2 میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کا خلاصہ

یہ ایک عشقیہ داستان ہے جو میر حسن کی جدتِ طبع کا نتیجا ہے۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا جس کے پاس سب کچھ تھا مگر کوئی اولاد نہ تھی اور اس وجہ سے بادشاہ بہت اُداس رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے فقیر بننے کی ٹھان لی۔ اس کے وزیروں نے اُسے فقیر بننے سے روکا اور گذارش کی کہ خدا پر بھروسہ رکھیں اور ساتھ ہی یہ عرض کیا کہ ہم نجومیوں کو بلاتے ہیں۔ اور آپ کی آئندہ زندگی کے حالات دریافت کرتے ہیں۔ نجومی، برہمن اور رمال اِکٹھے ہوئے اور اُنھوں نے بادشاہ کو بتایا کہ اُس کے گھر لڑکا تو ضرور ہوگا مگر بارہ سال تک اُسے باہر نہ نکالیں۔ کیوں کہ بارہویں سال میں اگر چہ جان کا خطرہ نہیں ہے تاہم ہمارے حساب سے جنگل جنگل گھومنا لکھا ہے۔ کوئی پری اس پر عاشق ہوسکتی ہے اور اس سبب سے کچھ پریشانی ہوسکتی ہے۔ لہذا یہ بارہویں سال تک بلندی پر نہ جائے۔ آخر بادشاہ کے لڑکا ہوا جو نہایت خوب صورت تھا۔ اُس کا نام بے نظیر رکھا گیا۔ اُس کی تعلیم و تربیت بڑے شاہانہ انداز سے ہوئی۔ اپنے نام ہی کی طرح وہ ہر فن میں بے نظیر ہوا۔ اس طرح بارہ برس گذر گئے۔ بارہ سال گذر جانے پر بادشاہ نے شہزادے کو نہایت عمدہ کپڑے اور جواہرات پہنا کر اپنی فوج کے ہمراہ سارے شہر کی سیر کو بھیجا۔ جب سیر سے واپس آئے تو شہزادے نے چاند کی بہار دیکھی اور دل میں ترنگ اُٹھی کہ کوٹھے پر سویا جائے اور چاندنی کا نظارہ دیکھا جائے۔ جب یہ خواہش بادشاہ سے بیان کی گئی تو اُس نے یہ خیال کر کے کہ بارہ برس تو نکل چکے ہیں، اجازت دے دی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ چوکیدار وغیرہ سو گئے۔ شہزادے کو بھی نیند آ گئی اور وہ سو گیا۔ اتفاق سے اُدھر ایک پری ماہ رخ کا گذر ہوا۔ اُس کی نظر شہزادے پر پڑی تو وہ اُس پر عاشق ہوگئی اور اپنے ساتھ اُسے تخت پر رکھ کر پرستان لے گئی۔ شہزادے کے والدین کو جب یہ خبر ملی تو وہ بہت رونے پیٹنے لگے۔ اُدھر شہزادے کی جب آنکھ کھلی تو اُس نے اپنے کو ایک اجنبی جگہ پر پایا۔ اُس کے پاس کھڑی پری نے اُس کے پوچھنے پر بتلایا کہ وہی اُسے اُٹھا لائی ہے اور وہ اس وقت پرستان میں ہے۔ مجبوراً شہزادہ وہاں رہنے لگا مگر وہ بہت اُداس رہتا۔ ماہ رخ چوں کہ اُس سے محبت کرتی تھی لہذا اُس کی حالت بے چین سی تھی۔ ماہ رخ نے شہزادے کی اُداسی دیکھ کر اُسے ایک گھوڑا دیا جو اُڑ سکتا تھا۔ جو اُسے ہر شام ایک پہر کی سیر کرا کر لائے،

مگر ساتھ ہی خبردار کیا کہ اگر اُس نے کسی سے دِل لگایا یا اُسے دھوکا دیا تو اُسے سخت سزا دی جائے گی۔

شہزادہ روز گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کرتا اور ایک پہر بعد واپس آجاتا۔ ایک دِن اُس نے اُڑتے اُڑتے ایک بُلند سفید عمارت دیکھی۔ وہ وہاں اُتر پڑا۔ درختوں کے پیچھے سے اُس نے ایک حسین وجمیل لڑکی کو ناز و انداز سے بیٹھا دیکھا۔ پاس اُس کے کچھ کنیزیں کھڑی تھیں۔ اُن میں سے ایک نے شہزادے کو دیکھ لیا۔ آپس میں باتیں ہونے لگیں۔ بات بدرمنیر کے کانوں تک گئی۔ اُس نے جب اُٹھ کر دیکھا کہ ایک نہایت خوب صورت نوجوان ہے، دونوں کی نگاہیں مِل گئیں اور دونوں ایک دُوسرے کی محبت میں اسیر ہو گئے۔ باتیں ہوئیں۔ ایک دُوسرے سے اپنی اپنی حقیقت بیان کی۔ شہزادے نے پری ماہ رخ سے متعلق سب کچھ شہزادی بدرمنیر کو بتایا اور یہ بھی بتایا کہ صرف ایک پہر کی رخصت و فرصت ہوتی ہے۔ اِس پر بدرمنیر ناراض ہوئی لیکن شہزادے نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ میں تمہارا اور صرف تمہارا عاشق ہوں اور اِس طرح وہ روزانہ ملنے لگے۔

ماہ رخ کو اچانک کسی دِن ایک دیو نے یہ بتایا کہ شہزادہ کسی اور پر عاشق ہو گیا ہے۔ پری نے غصّے میں آکر شہزادے کو ایک کنوئیں میں قید کر دیا۔ شہزادی بدرمنیر سے شہزادہ بے نظیر کئی دِن تک ملنے نہ آیا تو اُس کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ ہر وقت روتی رہتی۔ نہ کھانا، نہ پینا، نہ سنگار۔ بس دِن رات اُداس رہتی۔ وزیرزادی نجم النسا نے اُسے بہت تسلی دی۔ مگر وہ کسی طرح راضی نہ کر سکی۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ شہزادے کو ڈھونڈ کر لائے گی۔ اِسی غرض سے نجم النسا نے ایک جوگن کا بھیس بنایا اور اُس کی تلاش میں نکل پڑی۔ ایک دِن جب وہ ایک صحرا میں بین بجا رہی تھی تو جنوں کے بادشاہ کا لڑکا تخت پر اُڑتا ہوا اُدھر سے گزرا اور نجم النسا کو دیکھ کر نیچے آیا۔ پہروں اُس کی بین سُنتا رہا۔ وہ دِل و جان سے نجم النسا پر عاشق ہو گیا۔ فیروز شاہ نے آخر اُسے زبردستی تخت پر بٹھایا اور پرستان لے گیا۔ فیروز شاہ نے نجم النسا سے اپنے دِل کا راز ظاہر کیا کہ میں تم پر عاشق ہو گیا ہوں لہٰذا تم مجھ سے شادی کر لو۔ وزیرزادی نے بے نظیر اور بدرمنیر کی تمام کہانی سُنا کر کہا کہ یہیں کہیں شاید ایک پری نے اُسے قید کر رکھا ہے۔ جب تک میں اُسے ڈھونڈ نہ لوں گی، مجھے چین نہیں ملے گا۔ اگر تم اُسے ڈھونڈنے میں میری مدد کرو تو شاید تمہاری مُراد بھی جلد پوری ہو۔ فیروز شاہ نے اپنی ذات کے آدمیوں کو حکم دیا کہ دیکھو پرستان میں کوئی آدمی قید ہے، اُسے ڈھونڈ لاؤ۔ وہ لوگ اُسے ڈھونڈتے ہوئے اُس کنوئیں کے پاس پہنچے اور

وہاں سے بے نظیر کو نکال لائے۔ تب جوگن نجم النسا، فیروز شاہ اور بے نظیر کے ساتھ بدر منیر کے پاس آئی۔ بدر منیر کو فیروز شاہ اور نجم النسا کی محبت کے بارے میں بھی علم ہو گیا۔ بدر منیر اور بے نظیر بہت دِنوں تک چھُپ چھُپ کر ملتے رہے۔ آخر ایک دِن شہزادہ بے نظیر نے بدر منیر کے والد کو ایک عرضی لکھی اور بدر منیر سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ دونوں کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ بے نظیر اور بدر منیر کے لیے فیروز شاہ اور نجم النسا کی بھی شادی کرا دی۔ شادی کے بعد دونوں جوڑے اپنے اپنے شہر واپس آ ئے۔ بے نظیر جب شہر کے پاس واپس پہنچا تو نہر کے کنارے اُس نے اپنا خیمہ لگا دیا۔ لوگوں نے شہزادے کو دیکھا تو بادشاہ کو بتایا۔ پہلے تو بادشاہ کو یقین نہ آیا لیکن آخر وہ اپنے پسر سے ملنے آیا۔ دونوں خوب رو رو کر ایک دُوسرے سے ملے۔ بے نظیر کی ماں نے بھی اپنی بہو اور بیٹے کو رو رو کر اپنے کلیجے سے لگایا۔ والدین کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کا سہرا اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اس لیے اُنھوں نے بے نظیر اور بدر منیر کی دوبارہ شادی رچائی، بڑی دھوم دھام سے اور پھر دونوں بڑے امن وسکون سے رہنے لگے۔

10.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ مثنوی سحر البیان کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

2۔ میر حسن کی مثنوی نگاری مثنوی ''سحر البیان'' کے حوالے سے لکھیے۔

3۔ مثنوی سحر البیان کے اہم کرداروں کا تعارف بیان کیجیے۔

10.4 امدادی کتب

1. اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی ۱۱ سی، موتی باغ، نئی دہلی ۲۰۰۲ء
2. اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
3. مثنوی سحر البیان، از میر حسن، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو
4. اردو مثنوی کا ارتقا، جدید اڈیشن، از پروفیسر عبدالقادر سروری، ناشر ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ

اکائی 11: دیاشنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارنسیم'' کا خلاصہ

11.1 تمہید

11.2 دیاشنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارنسیم'' کا خلاصہ

11.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

11.4 امدادی کتب

11.1 تمہید

پنڈت دیاشنکر نسیم نے دو تصانیف ضبط تحریر میں لائی ہیں۔ ایک ''دیوانِ نسیم'' اور دوسری ''گلزارنسیم''۔ دیوانِ نسیم بہت مختصر ہے۔ اس میں مکمل و نامکمل غزلوں کی تعداد کم و بیش ۸۴ ہے۔ لیکن جس تصنیف نے بعد از مرگ نسیم کو اردو ادب میں زندہ رکھا وہ ''گلزارنسیم'' ہے۔

11.2 دیاشنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارنسیم'' کا خلاصہ

پنڈت دیاشنکر نسیمؔ کی مثنوی ''گلزارِ نسیمؔ'' اُردو شاعری میں اپنی قسم کی واحد مثنوی ہے۔ نہ اس سے پہلے اِس انداز و اسلوب میں کوئی نظم لکھی گئی اور نہ اس کے بعد۔ مثنوی کی کہانی ''قصہ گل بکاولی'' کے نام سے مشہور ہے جو ایک عشقیہ داستان ہے اور جو نثر میں پہلے سے موجود تھا۔

سلطان زین الملوک پُورب (مشرق) کا ایک بادشاہ تھا جس کے چار لڑکے تھے جو بڑے عقل مند تھے۔ اس

کے ایک اور بیٹا ہوا جس کا نام تاج الملوک رکھا۔ نجومیوں نے کہا کہ اگر بادشاہ (والد) اس کو دیکھے گا تو اندھا ہو جائے گا۔ بادشاہ کی رضا سے شہزادے کی پرورش الگ ایک محل میں ہونے لگی۔ جب شہزادہ جوان ہوا تو ایک دن اچانک بادشاہ کی نظر شہزادے پر پڑی اور وہ اندھا ہو گیا۔ تاج الملوک کے بھائیوں کو اس سے بہت دُکھ ہوا اور اُنھوں نے شہزادے کو بادشاہ کے اصرار کے باوجود شہر سے نِکال دیا۔ بادشاہ کی آنکھوں کے علاج کے لیے حکیم وید آنے لگے۔ شہر میں ایک بوڑھا آنکھوں کا معالج تھا۔ اُس نے بادشاہ کی آنکھیں دیکھیں اور تجویز کیا کہ اگر بکاولی کے پھُول کی پتیاں آنکھوں پر لگائی جائیں تو بادشاہ کی آنکھیں روشن ہو سکتی ہیں۔ بکاولی کا پھول جنّت میں تھا۔ چاروں شہزادے پھُول لانے کے لیے روانہ ہوئے۔ جنگل میں تاج الملوک بھی مارا مارا پھر رہا تھا۔ جب اُس نے اِتنی فوج دیکھی تو کِسی ایک سپاہی سے دریافت کیا کہ یہ فوج کِدھر جا رہی ہے۔ سپاہی نے سب بتایا جِسے سُن کر تاج الملوک بھی ایک سپاہی کے ہمراہ چل پڑا۔ فوج شام کو فردوس نامی ایک شہر میں پہنچی۔ وہاں دلبر نام کی ایک بیسوا کا گھر تھا۔ وہ ہر وقت اس تاک میں رہتی کہ کوئی دولت منداُس کے جال میں پھنسے اور وہ جُوا کھیل کر اُس کی ساری دولت لُوٹ لے اور اُسے غلام بنا لے۔ وہ ہمیشہ جیت جاتی اور کوئی اِس راز کو پا نہ سکا کہ وہ کیوں کر جیت جاتی ہے۔ دراصل اُس نے بلّی کے سر پر چراغ رکھا تھا اور چوہا پاس بیٹھا نگہبانی کرتا تھا۔ جب وہ ہارنے لگتی تو وہ دونوں جانور اپنے کمال سے بساط کو اُلٹ دیتے۔ یہ چاروں شہزادے بھی بیسوا کے جھانسے میں آ گئے۔ اپنا سب کچھ ہار کر خود اُس کے غلام ہو گئے۔

جب شہزادے بہت دیر تک واپس نہیں آئے تو تاج الملوک بھی اُنھیں دیکھنے اُس مقام کی طرف ہو لیا۔ تاج الملوک نے دیکھا کہ اُس محل سے ایک نوکرانی باہر آ رہی ہے۔ اب اُس عورت کا کوئی لڑکا کہیں کھو گیا تھا جو شکل وصورت میں تاج الملوک سے مُشابہ تھا۔ تاج الملوک کو دیکھ کر اُس کا دِل بھر آیا اور وہ اُسے اپنے ہمراہ گھر لے آئی۔ اُس عورت سے تاج الملوک کو اُس بیسوا کے فریب اور اپنے بھائیوں کی حالتِ زار کا پتہ چلا۔ تاج الملوک نے سوچا کہ اب میں چوں کہ اُس کے ہتھکنڈے جانتا ہوں اِس لیے اب میں بازی جیت لُوں گا۔ آخر اُس نے بیسوکو ہرا دیا اور خود گُل کی تلاش میں آگے بڑھا۔

تاج الملوک خاک چھانتا ہوا ایک جنگل میں پہنچا۔ وہاں ایک دیو جنّت کے بادشاہ کا پاسبان تھا۔ وہ کافی دِنوں

کا بھوکا تھا۔ تاج الملوک کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اُسے کھانا چاہا۔ لیکن خدا کی قدرت کہ اُسی اثنا میں وہاں سے سُوجی، اناج، گھی اور شکر سے لدا اُونٹوں کا ایک کارواں گزرا۔ دیو فوراً اُونٹ مار لایا۔ تاج الملوک نے دیو کو میٹھا بنا کر کھلایا۔ دیو بہت خوش ہوا اور اُس نے تاج الملوک کی مدد کا وعدہ کیا۔ تاج الملوک نے دیو کو گل کے بارے میں بتایا۔ تب دیو نے اپنے بھائی کو بُلایا اور اُسے ساری بات بتائی۔ اُس نے اپنی بہن کے نام ایک خط لکھا اور تاکید کی کہ ہر طرح سے اُس کی مدد کی جائے۔ اُس کی بہن حمالہ نے ایک سُرنگ تا باغِ ارم نکلوا کر تاج الملوک کو باغ پہنچادیا۔ وہاں ایک حوض میں وہ پھول تھا جس کو شہزادے نے حاصل کرلیا۔ وہ بکاولی کی خواب گاہ میں بھی گیا۔ تاج الملوک نے اپنی انگوٹھی بکاولی کی انگوٹھی سے بدل لی اور اُسی سُرنگ کی راہ سے واپس حمالہ کے پاس آ گیا۔ دُوسری صُبح جب بکاولی کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ پھول غائب ہے۔ وہ غصّے سے لال پیلی ہو اُٹھی۔ اچانک اُس کی نظر اپنی انگوٹھی پر پڑی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی اپنی انگوٹھی کی جگہ ایک ڈھیلی سی کسی اور کی انگوٹھی تھی۔

حمالہ دیونی تاج الملوک کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ تاج الملوک اور حمالہ دیونی کی لڑکی کہ جو اُس سے محبت کرتی تھی، نے اُس سے رُخصت چاہی تو اُس نے اپنے دو بال دیے کہ جب ضرورت پڑے اُنھیں آگ دِکھا کر وہ حمالہ کو بُلا سکیں۔ اس کے بعد تاج الملوک شہر فردوس میں دلبر کے پاس آیا۔ شہزادے نے اپنے بھائیوں اور دُوسرے قیدیوں کو آزاد کروایا اور حمالہ کی لڑکی، دلبر اور اُس کا تمام اسباب کشتیوں پر لدوا کر نا خدا کے حوالے کیا۔ اور خود جوگیا بھیس میں ملک کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک اندھے فقیر پر اُس پھول کو آزمایا۔ اُس کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ جب اُن چاروں کو اُس بارے پتہ چلا تو اُنھوں نے وہ پھول اُس سے چھین لیا اور اپنے ملک آ گئے۔ بادشاہ اُس پھول سے اچھا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں نُور آ گیا۔ اب بکاولی پریشان حال ماری ماری پھرتی، اُس پھول کی تلاش میں آخر اُس شہر میں آئی تو اُس نے دیکھا کہ وہاں خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ وہ اپنی جادوئی طاقت سے آدمی بن گئی۔ اُدھر سے بادشاہ کی سواری آرہی تھی۔ بادشاہ نے بکاولی کو دیکھا جو اب فرخ سیر بنی ہوئی تھی، تو بہت متاثر ہوا اور اُسے اپنا وزیر بنا کر بڑی عزت کے ساتھ لے آیا۔ اِدھر تاج الملوک بہت پریشان تھا۔ اُس نے حمالہ دیوانی کو بُلایا اور ایک خوب صورت محل اور تمام شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ بنانے کی گذارش کی۔ حمالہ نے فوراً ایک خوب صورت محل بمعہ ساز و سامان اور کنیزیں وغیرہ سب

کچھ مہیا کر دیا۔ بادشاہ نے محل کی خوب ورتی اور وہاں کے طلسماتی ڈھنگ کا تذکرہ سُنا تو چاروں شہزادوں اور اُس کے وزیر کے ہمراہ اس محل میں آیا۔ تاج الملوک کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ چاروں شہزادے میرے لڑکے ہیں۔ اور بھی ایک تھا جس کی وجہ سے میری آنکھوں کا نُور چلا گیا تھا۔ یہ چاروں میرے لیے گُلِ بکاولی لائے تو میں دیکھنے کے قابل ہو سکا۔

تاج الملوک نے پُوچھا کہ اُس بدنصیب شہزادے کو کسی نے دیکھا ہے۔ بادشاہ کے مصاحبوں میں سے کسی ایک نے اُس کو پہچان لیا۔ تاج الملوک نے اپنے والد کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔ بادشاہ نے اُسے گلے لگایا۔ شہزادے نے کہا کہ دو عورتیں آپ کی شرفِ بازیابی کی آرزومند ہیں لیکن آپ سے تنہائی میں مِلنا چاہتی ہیں۔ بادشاہ نے سب کو باہر بھیج دیا۔ مگر چاروں شہزادے چھپے رہے۔ تاج الملوک باہر آیا اور دلبر کو سکھا پڑھا کر اندر آنے کی ہدایت کی۔ دلبر نے کہا کہ یہ چاروں شہزادے میرے غلام ہیں۔ ان کے سامنے ہرگز نہ آؤں گی وہ چاروں یہ سُن کر بہت گھبرائے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر بادشاہ کو حالات سے باخبر کیا۔ بکاولی کو اب سب کچھ معلوم ہو گیا، اس لیے وہ اپنے ملک واپس چلی گئی۔ وہاں سے تاج الملوک کے نام ایک خط لکھا کہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میرا پھُول چُرایا ہے۔ اب بھلائی اسی میں ہے کہ تم چلے آؤ۔ ورنہ میں فساد کھڑا کر دوں گی۔ تاج الملوک نے جواب دیا کہ مُجھے وہاں منگوا لو ورنہ میں بھی تُمہارے بغیر جی نہ پاؤں گا۔ بکاولی نے تاج الملوک کو اپنے پاس بُلا یا اور دونوں محبت کی دُنیا میں کھو گئے۔

بکاولی کی ماں کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت غُصّہ ہوئی۔ اُس نے تاج الملوک کو ایک طلسمی سمندر میں ڈال دیا۔ بکاولی نے اُس کی جُدائی میں کھانا پینا سب چھوڑ دیا۔ تاج الملوک ایک جزیرے پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ ایک اژدھا آیا۔ اُس نے اپنے مُنہ سے ایک سانپ نکالا۔ اُس سانپ نے ایک مَن (روشنی دینے والا ہیرا) نکالا اور صُبح تک اوس چاٹتے رہے۔ صُبح کو اُس سانپ نے مَن اور اُس اژدھے نے اُس سانپ کو اپنے مُنہ میں ڈالا اور چلے گئے۔ ایک رات تاج الملوک نے اُس مَن پر گوبر ڈال دیا اور صُبح اُسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اب جس کے پاس یہ ہیرا ہو، اُس کی ہر خواہش پُوری ہو جاتی ہے۔ وہیں سے تاج الملوک نے طلسماتی گوند، چھال اور لکڑی لی اور چل دیا۔ راستے میں اُسے

بکاولی کی چچازاد بہن روح افزا ملی۔ وہ کسی دیو کے بس میں آ گئی تھی۔ دونوں کی منزل ایک تھی۔ لہذا تاج الملوک، روح افزا کو اپنے ساتھ لے اُڑے اور اُس کو اُس کے ماں باپ کے پاس لے گیا۔ روح افزا کے والدین بہت خوش ہوئے اور بکاولی کو مِلوانے اور تاج الملوک اور بکاولی کی شادی کے لیے اُس کے والدین کو راضی کر لیا۔ شادی کے بعد وہ دونوں اپنے محل آ گئے۔

ایک دِن راجہ اندر کو بکاولی کا خیال آیا۔ پُوچھنے پر پتہ چلا کہ اُس نے ایک آدم زاد سے شادی کر لی ہے۔ وہ بہت ناراض ہوا اور حُکم دیا کہ وہ خاک ہو جائے۔ بعد میں ایک فرشتے نے اُسے زندہ کر دیا۔ تب وہ ہر رات اندر کے دربار جانے لگی۔ تاج الملوک کو معلوم ہو گیا۔ ایک دِن وہ تختہ کا پایہ پکڑ کر طبلچی بن اندر کے دربار پہنچ گیا۔ اُس روز بکاولی کا ناچ دیکھ کر راجہ اندر بہت خوش ہوا۔ اُس نے بکاولی کو کہا کہ مانگ جو مانگتی ہے۔ اُس نے اُس طبلچی کو مانگ لیا۔ راجہ اِندر نے اِسے خلافِ قانون قرار دے کر بکاولی کا آدھا جسم پتھر کا بنا دیا۔ راجہ اِندر نے یہ بھی کہا کہ بارہ برس تک بکاولی اس حالت میں رہے گی اور اُس کے بعد دوبارہ جنم لے کر تاج الملوک کو حاصل کرے گی۔ تاج الملوک روز اُس بُت خانے میں جاتا جہاں بکاولی رکھی تھی۔ ایک دِن جب وہ بُت خانے جا رہا تھا کہ چترا وت کی لڑکی نے اُسے دیکھا اور اُس پر عاشق ہو گئی۔ تاج الملوک شادی ہو جانے کے بعد بھی جاتا رہا۔ اِدھر جب نئی دُلہن کو ساری بات کا علم ہو گیا تو اُس نے بُت خانے کو مسمار کروا دیا۔ کسانوں نے وہاں نئی زمین دیکھی تو بڑے خوش ہوئے۔ وہاں سرسوں کی کھیتی شروع کر دی۔ ایک کسان کی بیوی نے سرسوں کا ساگ کھایا اور وہ حاملہ ہو گئی۔ اُس کے ہاں ایک خوب صورت لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ بکاولی تھی۔ اُس کی خوب صورتی کا چرچا چاروں طرف پھیل گیا۔ جوان ہوئی تو بعد میں زیادہ نکھر گئی۔ تاج الملوک نے بھی اُس کی خوب صورتی کا ذِکر سُنا اور اُسے دیکھنے آیا۔ دیکھا تو لڑکی کوئی اور نہیں بل کہ اُس کی بکاولی ہی تھی۔ اِس طرح عاشق و معشوق دوبارہ مِل گئے اور اپنے وطن واپس آ گئے۔

11.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ مثنوی گلزار نسیم کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے۔

2۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی نگاری مثنوی ''گلزار نسیم'' کے حوالے سے لکھیے۔

3۔ مثنوی گلزار نسیم کے اہم کرداروں کا تعارف بیان کیجیے۔

11.4 امدادی کتب

1. اردو مثنوی: مطالعہ اور تدریس، از ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ناشر، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈی 11 سی، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

2. اردو مثنوی شمالی ہند میں، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

3. مثنوی سحر البیان، از میر حسن، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو

4. اردو مثنوی کا ارتقا، جدید اڈیشن، از پروفیسر عبد القادر سروری، ناشر ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ

اکائی 12: سر سید احمد خان کا انشائیہ ''کاہلی''

12.1 تمہید

12.2 سر سید احمد خان کا انشائیہ ''کاہلی''

12.2.1 انشائیہ ''کاہلی'' کے اقتباسات کا سلیس اردو

12.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

12.4 امدادی کتب

12.1 تمہید

انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون کی مانند لگتی ہے مگر مضمون سے الگ انداز رکھتی ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار آزادانہ طور پر اپنی تحریر پیش کرتا ہے، جس میں اس کی شخصیت کا پہلو نظر آتا ہے اور بغیر کسی خاص نتیجہ کے بات کو ختم کرتا ہے، یعنی نتیجہ کو قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ کسی مضمون کو جب ایک خاص انداز میں تحریر کیا جاتا ہے، جس کی بے ترتیبی کا اپنا ایک ربط ہوتا ہے اور بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے بظاہر اسی بے ترتیبی سے وجود میں آنے والی صنف کو، جس میں ایک شعوری ربط و تسلسل قائم رہتا ہے، انشائیہ کہتے ہیں۔ دو مشہور انشاء پردازوں کے نام مولانا محمد حسین آزاد اور سر سید احمد ہیں۔

12.2 سرسید احمد خان کا انشائیہ ''کاہلی''

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج، محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا۔ اُٹھنے بیٹھنے چلنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لئے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ مجبوری اس کے لئے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے اور اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا ان کی طبعیت ثانی ہوتی ہے مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے لیکن اگر انسان ان عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قویٰ کو بے کار ڈال دے تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔ انسان بھی مثل اور حیوان کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اس کے دلی قویٰ کی تحریک سست ہو جاتی اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بے کار نہ چھوڑے۔

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اس کے اخراجات کو مناسب ہو اور اس کو حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے جیسے کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج داروں کا حال تھا اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بیکار ڈال دے تو اس کا حال کیا ہوگا۔ یہی ہوگا کہ اس کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے۔ شراب پینا اور مزیدار کھانا اس کو پسند ہوگا۔ قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا۔ اور یہی سب باتیں اس کے

وحشی بھائیوں میں بھی البتہ فرق اتنا ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ، بدسلیقہ وحشی ہوتے ہیں اور یہ ایک وضع دار شہری ہوتا ہے۔شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا اور پیچوان کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے اور جنگل کے ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمبا کو کے دھوئیں اُڑانا اس کو پسند ہوتا ہے۔پس پیچوان اور ناریل اور بچھونے اور ریت کے فرق سے کچھ مشابہت میں جو ان دونوں میں ہے کمی نہیں ہوتی۔

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لئے ایسے کام بہت کم جن میں ان کو قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے اور برخلاف اس کے اور ولایتوں میں اور خصوصاً انگلستان میں وہاں کے لوگوں کے لئے ایسے موقعے بہت ہیں اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اگر انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اس کو شوق نہ رہے جیسا کہ اب ہے تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاویں گے۔مگر ہم اپنے وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے یعنی اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش چاہئے۔کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہو۔اگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اسی کی فکر اور کوشش چاہئے کہ وہ قصور کیوں کر رفع ہو۔غرض کہ کسی شخص کے دل کو بیکار پڑا رہنا نہ چاہئے۔ کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے تا کہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کا بیکار پڑے رہنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے نہایت حکیمانہ قول ہے کہ۔

بے کار مباش کچھ کیا کر   گر نہ کر سکے تو کچھ کہا کر

12.2.1 انشائیہ ''کاہلی'' کے اقتباسات کا سلیس اردو

اقتباس:

یہ ایک ایسا لفظ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سب سے بڑی کاہلی ہے۔

حوالہ:

یہ اقتباس سرسید احمد خان کے انشائیہ ''کاہلی'' سے ماخوذ ہے۔ اردو کے بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ سرسید اس صنف کے موجد ہیں۔ سرسید نے قوم کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لئے بے شمار مضامین لکھے۔ مروج روایات کو رد کیا اور بااخلاق و باکردار معاشرہ تشکیل کیا۔ زیر بحث انشائیہ ''کاہلی'' اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

سلیس:

سرسید احمد خان نے بہت قریب سے معاشرہ کو دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ لوگوں کے نزدیک محنت نہ کرنا، فضول پڑے رہنا ہی کاہلی ہے۔ لیکن صرف بیکار رہنا اور بے دست و پا ہوجانا ہی کاہلی نہیں ہے بلکہ جذبات واحساسات کے خاتمے کو بھی کاہلی کہا جاتا ہے، یعنی مردہ دلی ہی سب سے بڑی کاہلی ہے۔ جب کسی کام کے کرنے کا جذبہ پختہ ہوتو تب اعضا بھی کام کرتے ہیں اگر جذبہ ہی مردہ ہوتو سستی حاوی رہتی ہے۔

اقتباس:

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حیوان صفت ہوجاتے ہیں۔

سلیس:

زیر بحث اقتباس میں سرسید احمد خان نے کاہل لوگوں کو حیوان صفت قرار دیا ہے کہ جو لوگ محنت ومشقت کر کے اپنے کھانے پینے کا سامان یعنی روزی روٹی کماتے ہیں وہ بہت ہی کم کاہل ہوتے ہیں اور ذہنی وجسمانی طور سے تندرست اور خوش طبعیت ہوتے ہیں۔ جو لوگ عیش پرست اور ہاتھ پاؤں سے محنت نہیں کرتے ان کی زندگی میں اور

حیوانوں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں رہتا یعنی حیوان جیسی خصلتیں ان میں پائی جاتی ہیں۔

اقتباس:

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے-------------------------------------بے کار نہ چھوڑے۔

سلیس:

زیر بحث اقتباس میں انسان اور حیوان کی خصلتوں کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان علم حاصل کرنے کے بعد اگر عمل نہ کرے اور عیش و آرام کا عادی بن جائے تو سخت کاہل اور سست ہو کر رہ جاتا ہے۔ یوں تو بے شمار لوگ پڑھتے لکھتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ہی اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے خالی ذہن ہزار عیبوں کو جنم دیتا ہے اسی طرح جب انسان مردہ دلی کا شکار ہو جاتا ہے تو وحشانہ کاموں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک انسان کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے باطن کو زندہ رکھے یعنی اپنے جوش اور جذبے کو سست نہ ہونے دے اور ہمیشہ تحریک میں رکھے۔

اقتباس:

ایک ایسے شخص-------------------------------------دونوں میں بے کمی نہیں ہوتی۔

سلیس:

زیر بحث اقتباس میں سر سید احمد خان کہتے ہیں کہ کسی ایسے شخص کو خیال میں لا کر اس کی آمدنی کے متعلق سوچو جو بغیر کسی محنت و مشقت کے اس کو حاصل ہے، جس آمدنی سے اس شخص کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ اگر ہمارے ہندوستان کے باسیوں کا یہ حال ہو گیا تو انہیں بھی محنت مزدوری کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور ایک حیوان صفت زندگی جینے کے عادی ہو جاویں گے۔ بے عمل اور نکما زندگی جینے سے انسان بری عادتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، شراب پینا،

مزیدار کھانا کھانا، تماش بینی اور پھر تمبا کو پینا اس کا معمول بن جاتا ہے۔ ان خصلتوں کی وجہ سے انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا اگر فرق ہے بھی تو یہ کہ جانور پیٹ بھرنے کے بعد جنگل یا ریت پر پڑ جاتا ہے اور انسان پلنگ پر پڑ جاتا ہے ۔ ایسے لوگ صرف اپنے خاندان ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کے لئے باعث ننگ ہوتے ہیں۔

اقتباس:

ہم قبول کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نہایت حکیمانہ قول ہے کہ

بے کار مباش کچھ کیا کر   گر نہ کر سکے تو کچھ کہا کر

سلیس:

زیر بحث اقتباس میں سر سید احمد خان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں یہ ماننے میں کوئی حرض نہیں کہ ہندوستانیوں کے لئے ایسے کام بہت کم ہیں جن کے کرنے کے لئے اپنے ذہن اور دلی قوت کا استعمال کیا جائے۔ اس کے برعکس اگر ہم انگلستان کے لوگوں کو دیکھیں جو ہمہ وقت مصروف کار رہتے ہیں اگر وہ بھی محنت و مزدوری کرنا چھوڑ دیں تو جلد ہی بد خصلتوں کی طرف مائل ہو جاویں گے۔ سر سید اپنے ہم وطنوں سے کہتے ہیں کہ آج ہم جس بے روزگاری کا شکار ہیں اس کی وجہ صرف ہماری کاہلی ہے اور ہمیں کاہلی سے نجات پانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہم سب کو چاہئے کہ محنت و مشقت کر کے اپنی ضروریات کو پورا کریں اور خود کو بیکار اور نکما نہ رہنے دیں بلکہ کسی نہ کسی فکر میں مصروف رہنا چاہئے اور اپنی قوم و ملت کی بہتری کے لئے فکر مند رہنا چاہئے۔ سر سید چونکہ باعمل زندگی کے قائل تھے اس لئے دوسروں کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ کاہلی کا خاتمہ ہمارے باطن میں دبا ہوا ہے جب تک ہم باطن کو زندہ نہیں کرتے تب تک ہم حیوانی زندگی جیتے رہیں گے۔ آخر میں حکیمانہ قول سے اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ بیکار رہنے سے اچھا ہے کچھ کیا کر اور اگر کچھ کر نہیں سکتا تو کچھ کہا ہی کر۔

12.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ سر سید احمد خان کے انشائیہ ''کاہلی'' کا تعارف بیان کیجئے

2۔ انشائیہ ''کاہلی'' کی معنویت کیا ہے؟

3۔ انشائیہ ''کاہلی'' کی سلیس اردو کیجئے

12.4 امدادی کتب

1۔ اردو انشائیہ، از سید صفی مرتضی، نسیم بک ڈپو لکھنو

2۔ انشائیہ کے فنی سروکار (مضامین)، از ڈاکٹر احمد امتیاز، مرتب، ناشر، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

3۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، از پروفیسر نصیر احمد خاں، ناشر، اردو اکادمی دہلی۔

4۔ اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار ایک تجزیاتی مطالعہ، از ڈاکٹر ہاجرہ بانو، ناشر عرشیہ پبلی کیشنز۔ دہلی۔

5۔ انشائیہ کی بنیاد، از ڈاکٹر سلیم اختر، ناشر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

6۔ انشائیہ کے خدوخال، از وزیر آغا، ناشر، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی

7۔ انشائیہ کی روایت، مشرق ومغرب کے تناظر میں، از محمد اسد اللہ، ناشر، جعفر نگر ناگپور، مہاراشٹرہ

8۔ انتخاب مضامین سرسید، از پروفیسر آل احمد سرور، ناشر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

اکائی 13: محمد حسین آزاد کا انشائیہ ''سیر زندگی''

13.1 تمہید

13.2 محمد حسین آزاد کا انشائیہ ''سیر زندگی''

13.2.1 انشائیہ ''سیر زندگی'' کے اقتباسات کا سلیس اردو

13.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

13.4 امدادی کتب

13.1 تمہید

انشائیہ اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے جس میں عبارت کو سجا کر بات سے بات پیدا کی جاتی ہے۔ یہ صنف عربی سے اردو میں آئی بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ صنف اردو میں انگریزی سے آئی ہے۔ محمد حسین آزاد نے اردو میں پہلی بار باضابطہ طور پر انشائیہ لکھے ان سے قبل ،سب رس، میں بھی انشائیوں کے نمونے ملتے ہیں۔

محمد حسین آزاد ادبی مورخ بھی تھے اور شاعر بھی ، انہوں نے بچوں کیلئے درسی کتابیں بھی لکھیں لیکن انشائیہ نگاری میں انہیں سب سے اہم مانا جاتا ہے۔ نیرنگ خیال ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں آٹھ اور دوسرے میں پانچ انشائیے ہیں۔ پہلا حصہ زیادہ مقبول اور مشہور ہوا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ انشائیے

انگریزی مصنفین کے مضامین کے ترجمے ہیں یا ان کی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ خود آزاد نے بھی اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے انگریزی مضامین پڑھوا کر سنے۔

آزاد کے انشائیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تمثیلی انداز اختیار کیا۔ غیر مجرد اشیا اور صفات کو انہوں نے مجسم کر کے اشخاص کی طرح پیش کیا۔ ان کے ہاں ڈرامائیت بھی ہے اور قصہ کی سی کیفیت بھی ملتی ہے۔ ان کے انشائیے ایک خاص مقصد کو پیش کرتے ہیں۔ آزاد یہ چاہتے تھے کہ قوم کے حالات میں بہتری آئے وہ برائیوں سے دور رہیں اور اپنی زندگی کو سنواریں ان کے ہاں خیال کی عظمت اور اخلاقی نقطہ نظر غالب نظر آتا ہے جس کو انہوں نے رمز و کنایہ اور استعارے کے ذریعے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

13.2 محمد حسین آزاد کا انشائیہ "سیر زندگی"

ایک حکیم کا قول ہے کہ زندگی ایک میلہ ہے، اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں، یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے، نوجوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر یہی ہے۔ جب اس فقرہ پر غور کی، اور آدمی کی ادلتی بدلتی حالت کا تصور کیا، تو مجھے انواع و اقسام کے خیال گزرے۔ اول تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم ادنیٰ ادنیٰ چیز کا محتاج ہے۔ پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹنا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلبگار ہوتا ہے، ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور اس کے برخلاف ہے اس کا عاشق زار ہوتا ہے۔ پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کی جی نہیں چاہتا۔ میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتہً درد و مصیبت کی فریاد، خوشی کے ولولے، ڈر کی چیخیں، ہواؤں کے زور، پانی کے شور، ایسے اُٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا۔

اول تو دل بہت حیران ہوا۔ بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے، تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں اور اس غل کا کیا سبب ہے؟ ایک شخص برابر سے بولا کے صاحب جاتے کہاں ہو، دریائے حیات میں تیر رہے ہو۔ پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی کہ جس میں کچھ کشتیوں کی کمزوری سے، کچھ ملاحوں کی غفلت

سے، کچھ ان کی بے وقوفی سے، لاکھوں بھائی بند غارت ہو گئے۔ وہ نہر تو ہم اُتر آئے ہیں، اب مانجھ دھار سمندر ہے اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے، کبھی گرداب ہے، کبھی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ یہاں کی ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح بھی اُس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کئے ہیں، جو رستے بتاتے اور پار اتار دیتے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے۔ مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش جاتی ہے، نہ ملاح کی۔ فقط خدا کی آس ہے، اور بس

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں

سوارِ خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں

یہ سُن کر میں نے غور سے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا اور دل نے کہا کہ پہلے ذرا نظر اٹھا کر دیکھ تو لو۔ دیکھا، تو فی الحقیقت ایک نہر خوشنما گلزار کے بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہمراہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کی لہروں میں ظاہرانہ کچھ زور تھا، نہ شور تھا مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا، وہ اسے بلبلے کی طرح بہالے جاتی تھی۔ ان گلزاروں کا کچھ حال دیکھنا چاہو، تو بالکل اندھیرا تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ کہاں سے شروع ہوتا ہے یعنی جس نے آنکھ کھولی تھی۔ اپنے تئیں باغ ہی میں دیکھا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ لہر بہر میں بہتا چلا جاتا تھا اور دھند اتنی چھائی ہوئی تھی کہ تیز سے تیز نظر بھی کام نہ کرتی تھی، یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں ہیں۔ اور جا بجا گرداب پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں میں بامراد کے مزے لیتے چلے جاتے تھے اور جو بچارے پیچھے رہ گئے تھے، ان پر قہقہے اڑاتے تھے مگر یہ بھی ہنستے ہنستے انہیں گردابوں میں ڈوبتے جاتے تھے، دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا، یہ غضب تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی مشکل سے سنبھل سکتا تھا۔ انہی میں ایسے لوگ بھی تھے کہ ناواقف و نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں کو گردابوں میں دال دیتے تھے اور موجوں کے تھپیڑے انہیں چٹانوں پر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا اور کشتی کو اس کی ٹکر پر چڑھالانے کا تو کیا ذکر ہے، اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ کر بھی دھارے کے سامنے چڑھ آئے یا کاش کے جہاں سے چلا تھا پھر وہیں آجائے۔

سب اپنی اپنی کشتیوں کے برابر روک تھام سے سنبھالے چلے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطر نہیں۔ اگر ہے تو اور ہم سفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے تھے اور اپنی بدانجامی نہ معلوم

ہوتی تھی۔ خود اُسی مصیبت میں مبتلا تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے۔ جب موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بداعمالی جو سر پر سے پر ملائے برابر عالم ہوا میں اڑتی چلی جاتی تھیں، وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھیں۔ شخص خوش ہوتا تھا اور دل میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا تھا کہ الحمدللہ میری کشتی کو کچھ خطرہ نہیں ہے۔ جو گرداب اوروں کو نگل گیا، میں اس سے بچ جاؤں گا اور جن چٹانوں نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا، میں انہیں بھی بے لاگ پھاند جاؤں گا۔ غفلت نے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا کہ ساتھ کے جہازوں کی تباہی بھی دیکھتے تھے، مگر اُسی راستے چلے جاتے تھے۔ اس پر بے پرواہی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے، تو چپو بھی ہاتھ سے رکھ کر بھول جاتے تھے۔ پھر ناچار ہو کر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے۔

یہ سستی اور بے پرواہی ان کی کچھ اس لئے نہ تھی کہ اسی زندگی سے سیر ہو گئے تھے کیونکہ جب ڈوبنے لگتے تھے، تو سب چلاتے تھے، داد بیداد کرتے اور اپنے اپنے دوستوں کو چیخیں مار مار کر پکارتے تھے کہ برائے خدا، کوئی آؤ اور ہمیں سنبھالو۔ اور اکثر آخیر وقت میں لوگوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے کہ ہم تو اپنی حماقتوں کی بدولت ان حالتوں کو پہنچے، تم بچے رہنا۔ چنانچہ ان کی اس ہمدردی اور محبت پرستی پر، بہت سی تعریفیں بھی ہوتی تھیں، مگر ذرا سی دیر میں پھر بھول جاتے تھے۔ نہ وہ آپ سمجھتے تھے، نہ ان کی نصیحت پر کوئی اور عمل کرتا تھا۔ اِدھر اُدھر جزیروں کے کناروں پر کشتیاں اور جہاز ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ بہت سے مسافروں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ بہترے نیم جان، بہتیرے ایسی بیکسی اور تکلیف کی حالتوں میں تڑپتے تھے کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ ایک دوسرے کو ان کو مصیبت دکھا کر عبرت دلاتا تھا۔ مگر اپنے دل پر ذرا اثر نہ لاتا تھا۔ جس کشتی پر ہم سوار تھے حق یہ ہے کہ اس کے جوڑ بند بھی دریائے حیات کی موجوں کے صدمے اُٹھانے کے قابل نہ تھے، بلکہ رستے ہی میں ٹوٹتے نظر آتے تھے۔ اور سب ساتھیوں کو یقین تھا کہ کیسی ہی پُھرتی کریں یا زور لگائیں، ڈوبنے سے بچتے نہیں۔

جب ان آفتوں کا باہمی چرچا ہوتو جو مستِ غفلت زندگی کے نشے سے سرخوش بیٹھے تھے، وہ بھی غمگین ہو گئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے اور بُزدلے نامردوں کو زندگی عذاب موت ہو گئی۔ بلکہ رنج و غم کے بعد جن جن راحتوں کی امید ہوتی ہے اس سے بالکل مایوس ہو گئے، مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس آفت میں زیادہ خطر تھا وہی زیادہ تر بے پروا تھے۔ بلکہ سب کا جی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطر کا خیال دور ہی دور رہے۔ اور جو جانتے تھے کہ آگے ایسی مصیبتیں آئیں گی، جو اُٹھائی نہ جائیں گی، وہ سامنے نگاہ بھر کے نہ دیکھتے تھے، اس وقت کے لئے کچھ نہ کچھ مشغلے نکال لیتے تھے۔

امید تو ہمیشہ اس رستے میں ساتھ ہی رہتی تھی، اس سے ہنس کھیل کر دل بہلاتے رہتے تھے۔

جن لوگوں کی امید سے بہت راہ تھی اُن سے اس نے رفاقت کے بڑے بڑے وعدے کر رکھے تھے۔ مگر اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی جس کے سہارے سے بھاگ کر تو بچ جاتے۔ فقط اتنا وعدہ تھا کہ اوروں سے کچھ پیچھے ڈوبو گے۔ اور یہ بھولے بھالے احمق اتنے ہی وعدے پر راضی تھے۔ درحقیقت امید کی باتیں ان سے مسخرا پن کے طور پر تھیں، کیونکہ جتنی ان کی کشتیاں پرانی ہوتی جاتی تھیں، اتنی ہی بیخبری کے عہد نامے تازے کرتی تھیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ جنہیں ڈوبنے کا یقین تھا وہی کاروبار کے لئے زیادہ کمر کستے تھے۔

دریائے زندگی میں ایک بہت خوشنما جزیرہ نظر آیا، اسکے کنارے ہر دریا سے لگا ہوا ایک بلند منارہ تھا۔ اس پر سونے کے حرفوں سے لکھا تھا:

''بدعتدالیوں کا گلزار''

جہاں تک جزیرہ کی حد تھی، وہاں تک پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانیں بلند تھیں۔ اسی واسطے ایسے ہیبت ناک گرداب پڑتے تھے، جہاں سے کشتی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ چٹانیں بھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور جو کھلی تھیں، نہایت سرسبز اور خوشنما تھیں۔ جوانانِ مرغزار یعنی ہرے بھرے درخت ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے جھوم رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں، وہیں آرام اپنی پلنگڑی بچھائے لیٹا تھا، اور خوشی میٹھے میٹھے سُروں میں پڑی، ایک ترانہ لہرا رہی تھی۔ یہی مقام رہگزر عام کا تھا۔ اس لئے جو لوگ ادھر سے گزرتے تھے، یہاں کی سرسبزی ان کی آنکھوں کو ضرور طراوت دیتی تھی۔

ادراک کا ناخدا اپنے ہاتھ میں دوربین لگائے کھڑا تھا کہ مسافروں کو اسی سکڑے رستہ سے نکال لے جاتا تھا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ وہ کشتی کھینچنے کے لئے ان سے ڈانڈا مانگتا تھا کہ صحیح سلامت یہاں سے نکال دے۔ یہ اس باغ سبز پر ایسے محو ہو رہے تھے کہ جواب بھی نہ دیتے تھے خواہ وہ خفا ہو کر کہے، خواہ منتوں سے مانگے، تھوڑے ہی ہوں گے، جو اس کا کہنا بھی مانتے ہوں گے۔ اور دیتے تھے تو اس شرط پر دیتے تھے کہ ان سبزہ زاروں کے پاس سے ہو کر نکلنا کہ ذرا دیکھ کر ہی خوش کر لیں۔ اور عہد لے لو کہ پھر رستے بھر ہم کہیں نہ اٹکیں نہ اٹکیں گے۔ نہ سمجھتے تھے کہ برتنا تو درکنار ان بلاؤں کے پاس سے نکلنا بھی غضب ہے۔ چھوا اور ہوا۔

میں نے دیکھا کہ آخرادراک چابکدست کے تقاضوں اور منتوں سے دق ہوگیا اور جزیرۂ مذکور کی طرف لے چلا۔ اس جزیرہ نے کشتی کو اس طرح کھینچا، جیسے مقناطیس سوئی کو کھینچے۔ جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت پچھتائے اور جتنا زور تھا، سب لگا دیا لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلا، غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جانیں گنوا بیٹھے۔ ہاں، جن لوگوں پر ادراک چابکدست کی چالاکی تدبیر کارگر ہوئی، وہ بچے، مگر بڑے دُکھ اٹھا کر بچے۔ اور نکلے تو جس طرح پہلے چلے جاتے تھے، اسی طرح پھر موجوں کے تھپیڑوں میں پڑھ گئے۔ پانی کے تلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی۔ اور یہ بھی بادِمخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لیے جاتے تھے۔ آخر اِدھر اُن کے زور گھٹتے گئے۔ اُدھر کشتی حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے، خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ سب ڈوب گئے۔ مگر جو ڈوبتا تھا اپنی کوتہ اندیشی پر بہت پچتاتا تھا اور اوروں کو نصیحت کرتا جاتا تھا کہ ع 'من نہ کردم شما حذر بکنید، خبردار' کوئی جزیرۂ بداعتدالی کے سامنے نہ آنا۔

خدا کی قدرت کو جو ایسی ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی مرمت کرتے تھے۔ ان کے کاریگر بھی وہیں موجود تھے۔ بہت لوگوں کو اپنے کاریگروں بڑا بھروسہ تھا اور بعض کشتیاں بھی ایسی تھیں کہ انہیں تھوڑا ہی صدمہ پہنچا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ جنہوں نے تھوڑا صدمہ اٹھایا تھا، وہ بھی کچھ بہت نہ جیے۔ روز بروز مرض بڑھتا گیا۔ آخر ڈوب ہی گئے۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ بعض ضرب رسیدہ ایسے تھے کہ کاریگروں نے خود ان کی مدد میں پہلو بچایا مگر بہتر کاریگر خود ضرب رسیدوں سے پہلے ڈوب گئے کہ وہ خود اپنی آفتوں میں مبتلا ہو گئے۔

غرض سیر زندگی میں چلاک لوگوں نے بھی اگر پایا، تو اتنا ہی پایا کہ یہ کچھ پیچھے ڈوبے، وہ پہلے ڈوبے۔ بہتر ے مسافر ایسے بھی تھے کہ لڑکپن سے جن ہمراہیوں کے ساتھ ساتھ چلے آتے تھے۔ یعنی بادِمخالف برابر غرق کیے جاتی تھی۔ نہ ان بچاروں کو محنت تدبیر کرنی پڑتی تھی، نہ غم انتظار اٹھانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خوشی کی ٹکر کھا کر بچ نکلے تھے، وہ بھی آہستہ آہستہ ضعیف ہی ہوتے گئے۔ اگر چہ ہاتھ پاؤں مار مار کر پانی سے بہت لڑے، مگر کو اوروں پر پہلے گزری تھی، وہ ان پر پیچھے گزری۔ آخر معلوم ہوا، تو یہی ہو کہ امید کو بھی کنارۂ کامیابی تک پہنچنا مشکل ہے۔ یہ حالات دیکھ کر میرا دل ایسا زندگی سے بے زار ہوا کہ جی میں آیا آنکھیں بند کر کے اس دریا میں کود پڑوں۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نورانی صورت

،سبز لباس پہنے سامنے کھڑا ہے اور اپنے عصا سے اشارہ کر کے پاس بلاتا ہے۔ میں نزدیک گیا، تو اس نے ہاتھ میرے منہ پر پھیرا اور عصا اٹھا کر سامنے اشارہ کیا۔ خدا جانے دور بین الٰہی سے میری آنکھیں روشن کر دیں، یا کہر جو دھواں دھار ہو رہی تھی، اُسے اپنی برکت سے اڑا دیا۔ دیکھوں تو سبحان اللہ، صبح سعادت کا وقت ہے چمن لہلہے ،مرغان سحر کے چہچہے، پھولوں سے لہلہاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سمندر کا پانی جگمگ جگمگ لہریں مار رہا ہے۔ بڑے بڑے امرا شرفا خلعت ہائے فاخرہ اور زرق برق کے لباس پہنے، پھولوں کے طرے سر پر، ہار گلے میں ڈالے، ادھر ادھر درختوں میں شعر پڑھتے پھرتے ہیں۔ کچھ فواروں کے نیچے حوض میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ کچھ پھولوں کی کیاریوں میں بے تکلف لوٹتے ہیں اور گانا سن رہے ہیں۔ غرض کہ ہجوم بہار اور رسیلی آوازوں کے ستاروں نے وہ جمگھٹ کر رکھا تھا کہ شور قیامت بھی آئے، تو خبر نہ ہو۔ اس عالم کو دیکھ کر میرا ساغر دل خوشی سے چھلک گیا اور بے اختیار یہی جی چاہا کہ اگر باز کے پر ہاتھ آ جائیں، تو اڑوں اور اس باغ فرح بخش میں جا پڑوں۔ لیکن اس پیر بزرگ نے کہا کہ وہاں جانے کا کوئی رستہ نہیں، الا دروازۂ موت کہ جس سے تم ڈرتے ہو، دیکھو، وہ سرسبز اور رنگین جزیرے جو سامنے نظر آتے ہیں اور سمندر کے قالین پر گل کاری کر رہے ہیں۔ حقیقت میں اس سمندر سے بھی زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں تک تمہاری نظر کام کر سکے، بلکہ جہاں تک تمہارا خیال دوڑ سکے، اس سے بھی آگے تک لاانتہا چلے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں اور صاحب دلوں کے گھر یہیں ہوں گے۔ جن جن لذتوں کو دل چاہے اور طبعیت کیفیت اٹھائے، سب یہاں موجود ہیں۔ ہر جزیرہ باغ جنت کا مکان ہے کہ اپنے اپنے مکین کے لائق شان ہے۔ کیوں آزاد، کیا یہ مقام اس لائق نہیں کہ جان تک بھی ہو، تو دیجئے اور انہیں لیجئے۔ کیا اس زندگانی کو مصیبت سمجھنا چاہیے، جس کی بدولت یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں؟ کا موت سے ڈرنا چاہیے؟ کیا ملکِ عدم کو خوش ہو کر نہ چلنا چاہیے۔ جس کی بدولت ایسی ایسی نعمتیں حاصل ہوں؟ نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ اور سنتے ہو! نہ سمجھنا کہ انسان جس کے لئے بے زوال سامان ہیں، اسے یونہی پیدا کر دیا ہے۔ دنیا مقام امتحان ہے۔ ہم تم یہاں امتحان دینے آئے ہیں۔ امتحان کا نام سنتے ہیں میں چونک پڑا، آنکھ کھول کر دیکھا، تو کچھ نہ تھا۔

13.2.1 انشائیہ ''سیر زندگی'' کے اقتباسات کا سلیس اردو

اقتباس:

ایک حکیم کا قول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ادنیٰ ادنیٰ چیز کا محتاج ہے۔

حوالہ:

یہ اقتباس محمد حسین آزاد کے انشائیہ ''سیر زندگی'' سے لیا گیا ہے۔ محمد حسین آزاد بیک وقت انشاپرداز، محقق، تنقید نگار اور خاص طور سے جدید شاعری کے موجد تھے اور'' آب حیات'' ان کی زندہ کتاب ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب'' نیرنگ خیال'' انشاپردازی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جو انشائیوں پر مشتمل ہے۔ انشائیہ ''سیر زندگی'' میں آزاد نے زندگی کی حقیقت کو بیان کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی تو بالآخر فنا ہونی ہے لیکن انسان ہے کہ غلط فہمیوں میں جیتا ہے۔

سلیس:

اقتباس کا آغاز ایک حکیم کے قول سے ہوتا ہے کہ زندگی محض ایک میلہ ہے جس کو مختصر وقت میں ہی اجڑ جانا ہے۔ انسان کی زندگی کے مختلف پڑاو ہیں بچپن، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا، ان مراحل سے گزرتا ہوا انسان جب بڑھاپے میں داخل ہوتا ہے تو گزری عمر کو تصور میں لاتا ہے اور زندگی کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ زندگی وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی ہے اور انسان کی ضرورتوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے تو انسان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا اسیر محتاج ہو جاتا ہے۔

اقتباس:

سب اپنی اپنی کشتیوں کے برابر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پر چھوڑ دیتے تھے۔

سلیس:

اخلاقی درس پر مبنی اس اقتباس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ زندگی ایک سمندر ہے جس میں ہر عام و خاص کو اس ڈوبنا ہے۔ لیکن بے خبر انسان اس کشتی (زندگی) پر سوار (انسان) کتنا بے خبر ہے کہ دوسروں کی کشتیوں کو ڈوبتے دیکھ کر

بھی خود کو محفوظ سمجھتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ تمام خطرات دوسروں کے لئے ہیں۔ دوسروں کی آخرت کے چشم دید ہوئے لیکن اپنی آخرت کے چشم پوش۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے متلاشی رہتا ہے اور خود کو ان عیبوں سے بری سمجھتا ہے، جبکہ انسان خود ان خباثتوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ دوسروں کو تباہ و برباد دیکھ کر بھی اس خوش فہمی میں رہتا ہے کہ جن طوفانوں نے باقی والوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا میں ان سے بچ نکلوں گا اور جس طرح بڑے بڑے پہاڑوں اور کشتیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا، میں انھیں با آسانی پار کر جاؤں گا۔ غلط فہمی میں اس قدر مبتلا تھے کہ بڑے بڑے جہازوں کو فنا ہوتے دیکھ کر بھی اسی راستے کا سفر کرتے تھے۔ بے کردار، بداعمال انسان آخر میں اپنی بربادی کا دوش قسمت کو دیتا ہے اور قسمت پر چھوڑ دیتا ہے۔

اقتباس:

جب ان آفتوں کا باہمی چرچا ہوتو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دل بہلاتے رہتے تھے۔

سلیس:

اس اقتباس میں انسان کی زندگی کے ردوبدل اور تغیر و تبدل کا ذکر کیا گیا ہے کہ جو لوگ گمراہ تھے یا غفلت کے نشے میں جھوم رہے تھے انھیں جب طوفانوں اور آفتوں کے آنے کا راز معلوم ہوا تو لرز گئے اور دنگ رہ گئے۔ بڑے بڑے دل رکھنے والے بھی بزدل ہو کر نیم مردہ ہو گئے، ان کو زندگی اب عذابِ موت معلوم ہونے لگی۔ جو لوگ ایک امید لے کر چلے تھے کہ تمام دکھ دردوں کے بعد راحت نصیب ہوگی لیکن زندگی میں آنے والی آفتوں اور طوفانوں کا راز جاننے کے بعد مایوسی ان کا مقدر بن گئی۔ مزے کی بات تو یہ کہ جن لوگوں کو ان آفتوں کا زیادہ خطرہ تھا وہ ہی زیادہ لاپرواہ زندگی جیتے تھے اور کوشش یہ ہی رہتی تھی کہ ان خطرات کی اصلیت سے بے خبر رہیں۔ جو لوگ یہ جانتے تھے کہ ایک نہ ایک دن ان مصیبتوں کا سامنا کرنا ہی ہے، وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ خود کو ہمیشہ مصروف کار رکھتے تھے اور کبھی بھی ناامیدی کا شکار نہ بنے، زندگی کو خوش اسلوبی سے جیتے رہے۔

13.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ محمد حسین آزاد کے انشائیہ ''سیر زندگی'' کا تعارف بیان کیجئے۔

2۔ انشائیہ ''سیر زندگی'' کی معنویت کیا ہے؟۔

3۔ انشائیہ ''سیر زندگی'' کی سلیس اردو کیجئے۔

13.4 امدادی کتب

1۔ اردو انشائیہ، از سید صفی مرتضیٰ، نسیم بک ڈپو، لکھنو

2۔ انشائیہ کے فنی سروکار (مضامین)، از ڈاکٹر احمد امتیاز، مرتب، ناشر، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

3۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، از پروفیسر نصیر احمد خاں، ناشر، اردو اکادمی دہلی۔

4۔ اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار ایک تجزیاتی مطالعہ، از ڈاکٹر ہاجرہ بانو، ناشر عرشیہ پبلی کیشنز دہلی۔

5۔ انشائیہ کی بنیاد، از ڈاکٹر سلیم اختر، ناشر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

6۔ انشائیہ کے خدو خال، از وزیر آغا، ناشر، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی

7۔ انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں، از محمد اسد اللہ، ناشر، جعفر نگر ناگپور، مہاراشٹرہ

8۔ نیرنگ خیال، از مولوی محمد حسین آزاد، ناشر مالک آزاد بک ڈپو۔

اکائی 14: کنہیالال کپور کا انشائیہ ''برج بانو''

14.1 تمہید
14.2 کنہیالال کپور کا انشائیہ ''برج بانو''
14.2.1 انشائیہ ''برج بانو'' کے اقتباسات کا سلیس اردو
14.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات
14.4 امدادی کتب

14.1 تمہید

کنہیالال کپور ۱۹۳۶ء سے لکھنا شروع کیا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو میں ترقی پسند تحریک اور اس کے متوازی حلقہ ارباب ذوق کی سرگرمیاں عام ہوتی جارہی تھیں۔ اپنے حلقہ احباب میں ترقی پسندوں اور ارباب ذوق کے ارکان کے باوجود کپور نہ تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور نہ حلقہ ارباب ذوق سے۔ وہ ترقی پسندوں کے ساتھ بھی رہے اور انہوں نے حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں میں اپنے مضامین بھی پڑھے اور پھر ہر دو کے ادبی کارناموں اور موقف کو اپنے طنز کا نشانہ بھی بنایا۔ کنہیالال کپور کی دوربین نگاہیں زندگی کے ہر مخصوص شعبے پڑتی ہیں۔ سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی خرابیوں کو نہایت حسین اور مزاحیہ انداز میں منظر عام پر لاتے ہیں۔ ان کی تحریر کے تخیل میں فلسفیانہ گہرائی نہیں پائی جاتی۔ وہ کسی جماعت کے نظریہ سے متاثر ہو کر نہیں لکھتے بلکہ ہر بات اور ہر مسئلہ کو اپنے طور پر سمجھتے ہیں اور سماج یا فرد کی خرابیوں کو

بے لوث ہو کر پیش کر دیتے ہیں۔ سماج کے کئی کرداروں کی حماقتوں کو بڑی سنجیدگی سے متعارف کراتے ہیں۔ باوجود متانت کے واقعات اور حالات کچھ ایسے سلیقہ سے سامنے لاتے ہیں کہ پڑھنے والا زیرلب مسکراہٹ پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں خود ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ دوسروں کی کمزوریوں کا ماتم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔لیکن اسلوب بیان کی شوخی اور بے باکی فضا میں ایسی لہر دوڑاتی ہے جو قاری کو بار بار گدگداتی اور چھیڑتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ان کی وسیع النظری نے ان کی تحریروں میں تنوع پیدا کر دیا ہے۔معمولی باتوں میں بھی وہ نکات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں وہ گہرائی لانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔مگر دل آویزی سے یہ مقامات خالی نہیں ہیں۔روزمرہ کی باتوں کو پیش کر کے اصلاحی نقطہ نظر پیدا کرتے ہیں۔

14.2 کنہیالال کپور کا انشائیہ ''برج بانو''

یہ برج بانو کی داستان ہے۔ برج بانو کون ہے؟ آج کل کہاں ہے؟ اس کے عجیب وغریب نام کی وجہ کیا ہے؟ یہ تمام سوالات جس آسانی سے کئے جاسکتے ہیں شاید ان کے جوابات اتنی آسانی سے نہ دئے جاسکیں۔تاہم کوشش کروں گا کہ آپ کو برج بانو سے روشناس کرادوں ۔ برج بانو ایک خوبصورت عورت ہے جو پاکستان سے میرے ساتھ ہندوستان آئی ہے۔کیا میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں؟ نہیں صاحب! میں تو اتنا شریف واقع ہوا ہوں کہ خوبصورت تو کجا بدصورت پنواڑن کو بھی اغوا کرنا گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔کیا اسے مجھ سے محبت ہے؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے۔اگر آپ یہ پوچھتے ہیں کہ کیا مجھے اس سے محبت ہے تو یقیناً اس کا جواب اثبات میں دیتا ہوں۔وہ آج کل کہاں ہے؟ وہ میرے گھر رہ رہی ہے۔اُسے برج بانو کیوں کہتے ہیں؟ یہ سوال مجھ سے کئی اشخاص نے کیا ہے۔آپ پہلے شخص نہیں ہیں۔بہرکیف وہ بیان کئے دیتا ہوں اسے برج بانو کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا۔آپ کو یقین نہیں آتا؟ بہتر تو یہی ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کریں ورنہ مجھے ایک ایسے شخص کی سند پیش کرنی پڑے گی جو ایک باریش بزرگ ہے۔ جسے اس عورت کی پیدائش کے سب حالات معلوم ہیں۔ جسے میری طرح اس عورت سے عشق ہے آپ نے غلط سمجھا یہ لوگوں سے عشق نہیں کرتی،لوگ اس سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔دراصل اس عورت کی زبان میں کچھ

ایسی موہنی کشش ہے کہ جو شخص بھی اس کی باتوں کو سنتا ہے دل جان سے اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میری ہی مثال لیجئے میری عمر تیس برس کی تھی جب میں نے پہلی بار اسے ایک مجلس میں باتیں کرتا ہوا سنا۔

مجھے فوراً اس سے عشق ہو گیا۔ تیس برس کی عمر، ہمارے ملک میں جہاں انسانوں کی اوسط عمر صرف چھتیس سال ہے، عشق کرنے کے لئے نہایت غیر موزوں ہے لیکن میں مجبور تھا اور مجھ پر ہی کیا منحصر لکھنو میں ایک شخص رتن ناتھ سرشار وہ اس عورت کی زبان کے چٹخارے پر ایسا مرمٹا کہ ساری عمر اس کا نطق اس کی زبان کے بوسے لیتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس عورت کی شان میں ایک رباعی کہی تھی جس کا ہر مصرعہ پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ ہاں تو یہ عورت پاکستان سے میرے ساتھ آئی ہے۔ لیکن چند دنوں سے اُداس سی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کچھ لوگ پچھلے دنوں سے اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ نہ صرف اس سے بلکہ مجھ سے بھی۔ کل کا ذکر ہے کہ ایک لمبی چوٹی والے پنڈت جی جو میرے ہمسایہ ہیں، مجھ سے کہنے لگے۔ لالہ جی! کیا نداک ہے، آپ کے گھر میں ایک ایسی عورت رہتی ہے جس جس کا باپ مسلمان تھا۔ اور میرے کئی لمبے بالوں والے دوست مجھ سے بار بار کہہ چکے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اسے ساتھ لے آئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ سرحد پار کرنے سے پہلے اسے ستلج کی نذر کر دیتے۔ میں جب ایسی باتیں سنتا ہوں تو مجھ سخت رنج ہوتا ہے۔ لیکن برج بانو کے دل پر جو گزرتی ہے، وہ بیان سے باہر ہے، بے چاری ہر روز جلی کٹی سن سن کر تنگ آ گئی ہے۔ آج دو پہر کے وقت جب ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی تو میں نے اس سے کہا "برج بانو! میرا خیال ہے کہ تم پاکستان چلی جاؤ۔ یہاں یہ لوگ تمہیں رہنے نہیں دیں گے۔"

"لیکن کیوں؟" برج بانو نے چمک کر کہا "میرا قصور؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تمہارا باپ مسلمان تھا۔"

"لیکن میری ماں ہندو تھی۔"

"ولدیت کے معاملے میں ماں کو کوئی نہیں پوچھتا۔"

"یہ عجیب منطق ہے۔"

"جہاں جذبات ہی سب کچھ ہوں وہاں منطق کی دال نہیں گلتی۔" وہ اور بھی اُداس ہو گئی۔ میں نے بھری ہوئی آواز میں کہا "برج بانو! تمہیں اب یہاں سے اوشیہ چلے جانا ہوگا" ایک لمحہ تک وہ میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی،

جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو، اور پھر کہنے لگی ''اوشیہ کسی شہر کا نام ہے کیا؟'' ''شہر کا نام نہیں، اوشیہ ہندی میں ضرور کو کہتے ہیں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور کہنے لگی ''میری پرنانی بھی ضرور کو اوشیہ کہا کرتی تھی۔'' میں نے پوچھا ''تم ضرور کو اوشیہ کیوں نہیں کہتیں؟'' برج بانو نے طنز آمیز لہجہ میں کہا ''کہنے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔''

''بس اسی لئے تمہیں ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔'' یک لخت برج بانو کے چہرے پر غلیظ و غضب کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے چلا کر کہا کہ ''ہندوستان میرا گھر ہے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کس طرح جا سکتی ہوں؟''

''تمہارا گھر پاکستان ہے۔''

''یہ بالکل غلط ہے کہ پاکستان میری فتوحات میں سے ہے۔ میرا اصلی اور قدیمی وطن ہندوستان ہے۔ میں دلی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بچپنا جھونپڑی میں اور شباب لال قلعہ دلی میں بسر ہوا۔ مجھے تو ہندوستان کے شہنشاہ نے منہ لگایا، دیوان عام میں مجھے سب سے اونچی مسند پر پڑھایا گیا اور جس وقت میرا استارہ عروج پر تھا، کوئی بنگالی، گجراتی، سندھی حسینہ میرے حسن، میری بھڑک اور طنطنے کی تاب نہ لا سکی۔ میں ہندوستان ہوں اور ہندوستانی رہوں گی۔''

''یہ درست ہے پرنتو۔۔۔۔''

''یہ پرنتو کیا بلا ہوتی ہے جی؟'' برج بانو بے شرارت سے کہا۔

''پرنتو ہندی میں لیکن کو کہتے ہیں۔''

''ہاں یاد آیا میری نانی بھی لیکن کو پرنتو کہا کرتی تھی۔''

''تمہیں بھی اب لیکن کو پرنتو کہنا ہوگا۔''

''معاف کیجئے، میں تو لیکن ہی کہوں گی۔''

''یہی تو تمہاری غلطی ہے۔ اگر لیکن کو پرنتو نہیں کہو گی تو تمہیں یہاں سمجھے گا کون؟''

''ہر وہ شخص۔۔۔'' مثلاً ایک قلفی والا میری ڈیوڑھی کے آگے ٹھہر گیا۔ برج بانو اپنا آخری فقرہ مکمل کئے بغیر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہاتھ کے اشارے سے قلفی والے کو بلاتی ہے۔ ''قلفی کھائیں گے آپ؟'' وہ مجھ سے پوچھتی ہے۔ ''کیا یہ قلفی کھانے کا وقت ہے؟ میں تم سے نہایت اہم ترین باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آج تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم پاکستان جاؤ گی یا نہیں؟''

''پہلے قلفی کھا لیجئے۔ اس کے بعد ٹھنڈے دل سے آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔'' اور وہ قلفی والے کو مخاطب کر کے پوچھتی ہے ''کیسی ہے یہ قلفی تمہاری؟ میرا مطلب ہے کہ کچھ ٹھکانے کی ہے یا یوں ہی سہی؟ قلفی والا کنکھیوں سے برج بانو کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے'' اجی کیا پوچھتی ہیں، آپ میری قلفی؟ میری قلفی بے نظیر، لاجواب، شاندار۔''

برج بانو کے مغموم لبوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ جاتی ہے اور قلفی کھائے بغیر قلفی والے کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیتی ہے اور اس سے چلے جانے کو کہتی ہے۔ قلفی والا چلا جاتا ہے۔ میں اس سے بیٹھنے کو کہتا ہوں، لیکن وہ بدستور کھڑی رہتی ہے اور مسکراتی ہے۔

''کیا فیصلہ کیا تم نے، پاکستان جا رہی ہو نا؟'' وہ میری بات ان سنی کر کے ایک سکھ ڈرائیور کی لاری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہ دیکھئے۔ میں لاری کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ لاری کے فریم پر چند اشعار اردو میں لکھے ہیں جن میں

سے ایک یہ ہے۔

درودیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لاری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ایک چھابڑی والا زور سے چلاتا ہوا گلی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ چنا زور گرم بیچ رہا ہے۔

میرا چنا بنا ہے اعلیٰ　　　　اس میں ڈالا مرچ مسالا

چنا لایا میں بابو مزے دار　　　　چنا زور گرم

اب ایک اخبار فروش گلی میں آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں دس بارہ مختلف اردو روزنامے اور رسائل ہیں۔ برج بانو ایک اردو راز نامہ خریدتی ہے۔ لیکن جونہی اس کی نظر پہلی سرخی پر پڑتی ہے، اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ جلی حروف میں لکھا ہے "برج بانو اب ہندوستان میں نہ رہ سکے گی۔"

ایک لحہ کے لئے اس پر گویا بجلی سی گرتی ہے، اور وہ دھم سے گرنا چاہتی ہے لیکن میں بڑھ کر اس کا دامن تھام لیتا ہوں۔ دو چار منٹ ہم دونوں خاموش اور مبہوت کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے بعد میں اس سے کہتا ہوں، ضد نہ کرو بانو! تمہیں پاکستان جانا ہی ہوگا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کڑک کر کہتی ہے "میں نہیں جاؤں گی، ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

"لیکن حکومت نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تم۔۔۔"

حکومت قانون بنا سکتی ہے، لیکن عوام کے فطری رُجحانات کو نہیں بدل سکتی۔ جب تک ہندوستان میں قلفی والے، سکھ ڈرائیور اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں، حکومت میرا بال بیکا نہیں کرسکتی۔"

"خدا کی قسم بڑی ضدی ہو تم۔"

برج بانو مسکرا رہی ہے اور میں قلفی والے کے الفاظ زیر لب دہرا رہا ہوں۔

"لاجواب، شاندار، بے نظیر!"

14.2.1 انشائیہ ''برج بانو'' کے اقتباسات کا سلیس اردو

اقتباس:

میں تو اتنا شریف واقع ہوا ہوں کہ خوبصورت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے گھر میں رہ رہی ہے۔

حوالہ:

زیر بحث اقتباس کنہیالال کپور کے انشائیہ ''برج بانو'' سے ماخوذ ہے۔ انشائیہ جس پرلطف گفتگو کا نام ہے اس کی مثال ''برج بانو'' انشائیہ موجود ہے۔ انشائیہ برج بانو میں طنز و مزاح کے علاوہ ظرافت کا عنصر بھی شامل ہے۔ زبان کی بنیاد پر تفریق اور پھر رشتوں کی ترجمانی بھی اس انشائیہ کا اہم عنصر ہے۔

سلیس:

اس اقتباس میں کنہیالال کپور اپنی شرافت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک شریف شخص ہوں جس کے لئے خوبصورت اور حسین عورت تو دور سیاہ صورت عورت کو بھی اغوا کرنا گناہ کبیرا سمجھتا ہوں۔ کیا برج بانو کو مجھ سے محبت ہے؟ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے لیکن اگر اس کے برعکس مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ کیا مجھے اس سے محبت ہے تو اس کا جواب ہاں میں دوں گا اور بالکل واضح الفاظ میں کہوں گا کہ مجھے اس سے محبت ہے، یہاں تک کہ برج بانو کی خوبصورتی کا عاشق ہوں۔

اقتباس:

بہتر تو یہی ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کریں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سو صفات پر مشتمل ہے۔

سلیس:

کنہیالال کپور اس اقتباس میں اپنا یقین دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری بات کا بھروسہ کیا جائے ورنہ ثبوت کے لئے مجھے ایک باریش بزرگ کو پیش کرنا ہوگا، جس کو برج بانو کی پیدائش کے متعلق سب معلوم ہے اور جس کو میری طرح اس برج بانو سے محبت ہے۔ لیکن یہ سوچنا غلط ہے کہ برج بانو بھی لوگوں سے محبت کرتی ہے بلکہ لوگ اس سے محبت

کرتے ہیں۔ برج بانو کی باتوں میں اس قدر جادو ہے کہ جو بھی سنتا ہے وہ دل و جان سے برج بانو کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ آپ کے سامنے میری ہی مثال موجود ہے کہ میں نے اپنی تیس برس کی عمر میں برج بانو کو ایک مجلس میں بولتے سنا تھا تو فوراً مجھے اس محبت ہو گئی تھی۔ ہمارے ملک (ہندوستان) میں جہاں ۳۶ سال انسانوں کی آدھی عمر ہوتی ہے جو محبت کرنے کے لئے مناسب نہیں ہوتی لیکن میں مجبور تھا، صرف میں ہی کیا لکھنؤ شہر کا ایک شخص جس کا نام رتن ناتھ سرشار تھا برج بانو کی زبان پر اس قدر فریفتہ تھا کہ ساری عمر ایک ایک بول کے بوسے لیتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ رتن ناتھ سرشار نے برج بانو کی شان میں ایک رباعی لکھی تھی جس کا ایک مصرعہ پانچ سو صفات پر مشتمل تھا۔

اقتباس:

جہاں جذبات ہی سب کچھ ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔لیکن زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔

سلیس:

کنہیا لال کپور برج بانو سے کہتے ہیں کہ جس وقت جذبات قوی ہوں تو اس وقت ہزار دلائل اور استدلال کسی کام کے نہیں ہوتے۔ برج بانو یہ سن کر اداس ہوتی ہے۔ کنہیا لال کپور کہتے ہیں، برج بانو! آپ کو ہندوستان سے اب اوشیہ (ضرور) چلے جانا ہوگا۔ برج بانو چونکہ پاکستان سے ہندوستان آئی تھی تو ہندی زیادہ نہیں سمجھتی تھی اس لئے اوشیہ لفظ سنتے ہی کنہیا لال کپور کے منہ کی طرف دیکھتی رہی، تھوڑی دیر کے بعد پوچھنے لگی کے یہ "اوشیہ" کی شہر کا نام ہوتا ہے کیا؟ تب کنہیا لال کپور سمجھاتے ہیں کہ اوشیہ ہندی میں ضرور کو کہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی برج بانو کھل کر ہنسنے لگی اور کہا کے میری پرنانی بھی ضرور کو اوشیہ کہا کرتی تھیں۔ جب کنہیا لال کپور نے یہ جاننا چاہا کہ تم ضرور کو اوشیہ کیوں نہیں کہتی تو برج بانو کہتی ہیں، میں کوشش کرتی ہوں ضرور کو اوشیہ کہنے کی لیکن میری زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔

اقتباس:

ایک لمحہ کے لئے اس پر گویا بجلی سی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہرگز نہیں جاؤں گی۔

سلیس:

برج بانو جب یہ خبر سنتی ہے کہ "برج بانو اب ہندوستان میں نہ رہ سکے گی" تو ایک لمحہ کے لئے گویا بے جان ہو کر

گرنا چاہتی ہے لیکن کنہیالال کپور آگے بڑھ کر اس کو تھام لیتے ہیں۔ دو چار منٹ دونوں خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ ذرا دیر بعد کنہیالال کپور برج بانو سے کہتے ہیں کہ اتنی ضد نہ کرو، آپ کو پاکستان جانا ہی پڑے گا۔ لیکن برج بانو یہ سنتے ہی تنگ آئی شیرنی کی طرح دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ میں بالکل نہیں جاؤں گی۔

14.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ کنہیالال کپور کے انشائیہ ''برج بانو'' کا تعارف بیان کیجئے۔

2۔ انشائیہ ''برج بانو'' کی معنویت کیا ہے؟۔

3۔ انشائیہ ''برج بانو'' کی سلیس اردو کیجئے۔

4۔ انشائیہ ''برج بانو'' کے حوالے سے کنہیالال کپور کی انشائیہ نگاری پر نوٹ لکھئے۔

14.4 امدادی کتب

1۔ اردو انشائیہ، از سید صفی مرتضیٰ، نسیم بک ڈپو، لکھنو

2۔ انشائیہ کے فنی سروکار (مضامین)، از ڈاکٹر احمد امتیاز، مرتب، ناشر، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

3۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، از پروفیسر نصیر احمد خاں، ناشر، اردو اکادمی دہلی۔

4۔ اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار ایک تجزیاتی مطالعہ، از ڈاکٹر ہاجرہ بانو، ناشر عرشیہ پبلی کیشنز دہلی۔

5۔ انشائیہ کی بنیاد، از ڈاکٹر سلیم اختر، ناشر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

6۔ انشائیہ کے خدوخال، از وزیر آغا، ناشر، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی

7۔ انشائیہ کی روایت، مشرق ومغرب کے تناظر میں، از محمد اسد اللہ، ناشر، جعفر نگر ناگپور، مہاراشٹرہ

8۔ برج بانو، از کنہیالال کپور، ناشر، ساقی بک ڈپو، دہلی

اکائی 15: پطرس بخاری کا انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا''

15.1 تمہید

15.2 پطرس بخاری کا انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا''

15.2.1 انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کے اقتباسات کا سلیس اردو

15.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

15.4 امدادی کتب

15.1 تمہید

پطرس خالص مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ فنکار بھی نظر آتے ہیں ایک خالص مزاح نگار کی حیثیت سے ہر مضمون میں مزاح کے لیے اپنی ذات کو پیش کرتے ہیں اور ایک متوازن فنکار کے لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ چاہے کتوں کا خوف ہو، ہاسٹل میں داخلہ ہو، سحر خیزی ہو، لیڈری میں انڈے کھانے ہوں، سینما کا عشق ہو، بیوی سے وفاداری والا معاملہ ہو، بیبل سے کتاب بینی کا مقابلہ ہو۔ یا سائیکل پر سوار ہو کر گر پڑنا ہو وہ کہیں بھی اپنی ذات کو یوں پیش کرتے ہیں کہ قاری اسے مسخرہ یا بانڈھ سمجھے۔ وہ زندگی کی ناہمواریوں کو یوں سامنے لاتے ہیں کہ قاری بھی اُسے ہمدردی سے دیکھنے لگتا ہے اور اس خوبی نے ان کی مزاح کو اعلیٰ درجے کی ظرافت کا درجہ دیا ہے۔

پطرس بخاری کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی انشائیہ نگاری کو تمسخر اور طنز سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ ان کے

انشائیوں میں شوخی اور لطافت کی پاکیزہ آمیزش ہے۔ اس میں اتنی تلخی نہیں کہ طنز بن جائے اور اتنی کھلی ظرافت بھی نہیں کہ متانت سے گر جائے۔ ان کا لطیف مزاح ان کے انوکھے زاویہ نظر سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ مزاح پطرس کی غیر معمولی ذہانت، عمیق مشاہدہ کی عادت اور شگفتہ طرز بیاں کی قوت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

ایک بڑا انشائیہ نگار ہونے کے لیے ایک بڑی شخصیت بھی درکار ہوتی ہے اور پطرس بلاشبہ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بلحاظ منصب بڑے اور اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور ان عہدوں کی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے انھیں بہت کم فرصت ملتی کہ وہ ادبی مشاغل کی طرف توجہ دیتے۔ اگرچہ انہوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن جو لکھا وہ خوب لکھا اور معیاری و بلند مرتبہ ہے۔ ان کی تحریریں بھی خالص ادبی مزاح کے بہترین نمونے ہیں۔ قاری کی حسِ مزاح کو بیدار کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں سے ظرافت کی کلیاں کھلاتے چلے جاتے ہیں، ان کے ہاں طنز کی گہرائی کہیں نظر نہیں آتی، وہ صرف گدگداتے، چٹکیاں لیتے اور ہنساتے ہیں۔ یہی ان کی اشائیہ نگاری کی خصوصیات ہیں۔

15.2 پطرس بخاری کا انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا''

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی، ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔ جب ہم نے انٹرس پاس کیا تو مقامی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا۔ وہ لڑکا جسے آج تک کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے، چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے مطابق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان

نے خدا کے فضل سے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس لئے وظیفے کا ملنا بھی خصوصاً رشتہ داروں کے لئے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخر و مباہات کا باعث بن گیا اور مرکزی رشتہ داروں نے تو اس کو پاسِ وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر مختوں کی شرافت و نجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہر حال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی، اس لئے بلا تکلف یہ فیصلہ کیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہیں کی گئی، لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانب دار، ایماندار مصنف یعنی یونیورسٹی میں ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی، اب ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ تعلیم کے ساتھ فرصت کے لمحات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹو گرافی، تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام، غرض کہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالانشین پیشے سیکھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح سے کسی کا لڑکا بھی ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔ لیکن پھر بھی ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لوہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی اور بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقش کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بے حد موزوں ہے، اس ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں پڑھنے لکھنے کو جگہ تو ضرور

دی گئی۔ لیکن ایک مناسب حد تک، تا کہ طبعیت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے، اور فطرت اپنا کام حسن وخوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیل دار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مہمل سا مشورہ دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد صاحب پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر کی پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ ومصیبت کا ایک دوزخ ہے، ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا، چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے جو طلبا، باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری نگہداشت نہ کی جائے تو اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور کسی نالے میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں، یا کسی جوئے خانے میں ہزار بارہ سو روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں، یا سرف ایئر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بار شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر، وہ بہت ٹھیک، مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصف العین ہی بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے، تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور وخوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لئے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں لاہور میں اور رہیں ماموں کے گھر۔ اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ گیا تھا وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے یہ سوچا یہ ماموں صاحب اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھیلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی جمنے لگی۔ سینما جانے کی کبھی کبھار اجازت مل جاتی تھی، لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا

جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا۔ کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں۔ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار خط لکھنا ضروری تھا۔ سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے، گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے، ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن زندگی میں جو ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہئے، وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں، کس کمرے سے کسی کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ پہنچ سکتی، کس دروازے سے کمرے کے کونے میں جھانکنا ناممکن ہے، دروازہ گھر کا کون سا رات کے وقت کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا ملازم ناموافق ہے؟ کون سا نمک حلال، جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشو و نما کے لئے چند گنجائشیں پیدا کر لیں ،لیکن پھر بھی روزانہ دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلباء کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں، ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا: والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں ہے لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا، اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے، اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادئیگی سے نہیں روک سکتی۔

چنانچہ گرمیوں کی تعطیلات میں، میں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار کر رکھیں، گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے از حد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور فتنہ خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے مظلوم اشفاق کا واقع بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بیچارا ہاسٹل کو واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی، دو منٹ دیر سے پہنچا، صرف دو منٹ، بس صاحب بس، پھر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے تار دے کر اس کے والد کو بلوایا، پولیس سے تحقیقات کرانے کو کہا اور مہینے بھر کے لئے اس کا

جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان کی واضح نہ ہوئی، پھر ایک دن موقع پا کر بچارے محمود کا واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک دفعہ شامت اعمال بیچارہ سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کے بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ پس اتنی ہی فضول خرچی پر اسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر ہوئے۔ ان کے رویے سے بس فوراً احساس ہوا کہ ایک روپیہ اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہئے تھا۔

انہیں ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔ اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر آئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا، دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی آ گئی تھی، پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں، وہ اب نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہوا، اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ ہم کو محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالوں کی نوبت آئی تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلباء کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں، ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے، ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے جانتا ہے کہ والدینی اغراض کے لئے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اس نئے پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتہ ان کے نام منی آرڈر پر منی آرڈر چلا آتا ہے۔

بتا واں آں چناں روزی رساند

کہ دانا اندراں حیراں ماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر، اس کا انحصار ان دو مضمون پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تو ایک دن والد نے پوچھا:

''تمہارا شخصیت سے آخر کیا مطلب ہے؟''

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معرض کا موقع دیں۔ میں نے کہا: ''دیکھئے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے وہ کالج میں پڑھتا ہے، اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے۔ اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی، لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی کو گویا پہچانا جاتا ہے، میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ صرف دماغ سے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بیمار ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت مکمل ہو۔ دماغ کو بیکار نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ انسان خبطی ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی اگر ہو بھی۔۔۔ تو بھی گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے۔۔۔ ٹھہریے میں ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

ایک منٹ کی بجائے والد صاحب نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہئے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے، سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے، کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟

تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہئے؟

میں نے کہا: چال چلن ہی کہہ لیجئے۔

''اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے۔''

میں نے نسبتاً نحیف آواز میں کہا: ''جی ہاں''

''یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز، روزوں کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں، سچ زیادہ بولتے ہیں، نیک زیادہ ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا ''جی ہاں''

کہنے لگے۔ ''وہ کیوں؟''

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا۔

اس کے بعد سال بھر میں ماموں کے گھر میں: ''زندگی ہے تو خزاں کے دن بھی گزر جائیں گے'' گاتا رہا۔

ہر سال درخواست کا یہی حشر رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری، ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹی میں پہلے سے زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔ نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں اور ان ''بیرون از کالج'' ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے، صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لئے کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائینہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلباء سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس سے رسوخ بڑھتا ہے لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر گھر پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے ایک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا، پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنزآمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی ہرگز نہیں، حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی اے کا امتحان دیا تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا تو گھر والوں نے میری اُمنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا لیکن کلام میں وہ پہلی جیسی شوکت اور میری

رائے کی پہلی جیسی وقعت اب نہیں رہی تھی۔

میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس سے آپ میری زندگی کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے اور اس کے علاوہ یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی اے میں کیوں فیل ہوا، اس کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا، اس لئے ہم کچھ پاس ہی ہوگئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے، شاید اس لئے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر اس میں کوئی سفر کر رہے ہوں۔ نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے)

اب جب ہم بی اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے سوچا کہ بی اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لئے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا، لیکن ہمیں سب لوگوں سے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہوگئے۔ چنانچہ بی اے میں ہمارے مضامین انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کے بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اسی طرح سے جو صورتحال پیدا ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے، ہماری قوت مطالعہ منتشر ہوگئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا، وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔

آپ یقین مانئے کہ اس سے بڑا فرق پڑ جاتا اور فرض کیجئے اگر میں وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں ضرور پاس ہو جاتا۔

لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو کہ ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر کما حقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں پاس تو ہو گیا۔ لیکن بی اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری

زبان نہ تھی۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہوگیا اب آپ ہی سوچئے گا کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان میں صرف کرنا پڑتا۔ وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا۔ بلکہ اس کے بجائے۔۔۔ مگر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے از حد حیرت کا موجب ہوا، اور سچ پوچھیے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت ڈھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہئے تھا لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو، مطالعہ نہیں کر سکتیں، کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں کامیابی حاصل کی، باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے، لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے گا اپنے مطالعے کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبعیت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا مشکل ہے، پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں پاس ہو گئے۔

۱۔ انگریزی، تاریخ، فارسی

۲۔ انگریزی، تاریخ

۳۔ انگریزی، فارسی

۴۔ تاریخ، فارسی

گویا جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے، وہ ہم نے سب پورے کر دیے۔ اس کے بعد ہمارے لئے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے

مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کیا۔

۵۔ تاریخ میں فیل

۶۔ انگریزی میں فیل

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے، ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے، وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ از حد جانکاہ ہوگا۔ لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا، بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہو ں گے۔ پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ اس سال فارسی می فیل ہوں گے۔ پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا تنظار کرنے لگے، یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا بلکہ اس دفعہ پاس ہونے کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لئے بی اے ہو جائیں گے۔ ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا والدین کو نتیجہ کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والد کو اکثر یقین نہ آتا تھا۔ ایسے موقعوں پر طبعیت پر بڑی الجھن ہوتی، مجھے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ میں پرچوں پر کیا لکھ آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا تھا ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں، تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تا کہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسرِ نفسی سمجھتے ہیں، آخری سالوں میں والد صاحب کو فوراً یقین آ جایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا، ادھر ادھر کے لوگ ''اجی کیا کہہ رہے ہو''۔ ''اجی یہ بھی کوئی بات ہے۔'' ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہر حال اب کے گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور فیل ہونے کی پیشگوئی کر دی۔ دل کو تسلی تھی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشگوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہئے۔ اب تو کالج میں صرف ایک سال باقی رہ گیا ہے

۔اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں اور ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔آزادی کا ایک سال،صرف ایک سال اور یہ آخری موقعہ ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا،ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا۔اور ان سے والد کو خط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو آپ ہاسٹل ضرور بھیج دیں،بعض کامیاب طلباء کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشت بھجوادیں۔خود اعداد و شمار ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے طلبہ پاس ہوتے ہیں،ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں،اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔والد کا انکار نرم ہوتے ہی غور و خوض میں تبدیل ہوگیا۔لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہوا کہنے لگے:میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو،وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے۔جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی میں دستیاب نہیں ہوسکتی،ہاسٹل میں جسے دیکھو بحرالعلوم میں غوطہ زن ہیں۔باوجود اس کے کہ باہر ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جابجا طلباء علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتا ہیں۔علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے ہاسٹل کے چمن میں نظر آتا ہے۔کھانے کے کمرے میں کامن روم میں،غسل خانوں میں،برآمدوں میں،ہر جگہ لوگ فلسفہ اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے،وہ رات کو آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ریاضی کے طلباء اپنے ایک خیال کو الجبرا میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔فارسی کے طلباء،رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں،تاریخ کے دلدادہ۔۔۔

والد صاحب نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار تھا کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔اس دوران میں ہم نے ان تما

م دوستوں سے خط و کتابت کی۔ جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی۔ اور انہیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا، کیوں کہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہاسٹل میں آرہے ہیں۔ جس سے ہم طلباء کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے، اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی۔ جس کے ارد گرد نا تجربہ کار طلباء مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے، اور فلاں فلاں قواعد سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہوگئے۔ ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

15.2.1 انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کے اقتباسات کا سلیس اردو

اقتباس:

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

حوالہ:

زیر بحث اقتباس پطرس بخاری کے انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' سے لیا گیا ہے۔ پطرس بخاری نے بہت کم انشایئے ہی لکھے لیکن اردو کے بڑے انشاپردازوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ہاسٹل میں پڑھنا انشائیہ میں مزاحیہ انداز میں طالب علموں کی ناہمواریوں کی ترجمانی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ طالب علم کس طرح آرام دہ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔

سلیس:

پطرس کہتے ہیں کہ ہم نے کالج کی تعلیم تو حاصل کی اور اللہ اللہ کر کے بی۔ اے کا امتحان بھی پاس کرلیا لیکن اس دوران ہاسٹل میں جانے کی اجازت ایک ہی مرتبہ ملی۔ ہاسٹل میں رہنے کی اجازت ملنے کو پطرس خدا کا فضل سمجھتے ہیں اور

حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ کب اور کس طرح ہم پر مہربان ہوا، ایک طویل بحث ہے جو تفصیل طلب ہے۔ جب ہم نے انٹرس پاس کیا تو اپنے اور بیگانوں نے مبارک باد دی، اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے خاص طور پر مبارک دی۔

اقتباس:

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہیں کی گئی، لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانب دار، ایماندار مصنف یعنی یونیورسٹی میں ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی، اب ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ تعلیم کے ساتھ فرصت کے لمحات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹو گرافی، تصنیف و تالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام، غرض کہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالا نشین پیشے سیکھے جا سکتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

سلیس:

مجھ سے بھی رائے پوچھی گئی جب کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھ سے کوئی رائے لی گئی ہو لیکن اب وقت بدل گیا تھا۔ میری یونیورسٹی کی بیدار مغزی نے یہ یقین دہانی کروا دی تھی جس کی وجہ سے مجھے اب نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ مجھے کسی دوسرے ملک میں جانے دیا جائے اور میں نے بہت سارے نمائندوں کی تقریروں کا حوالہ بھی دیا کہ اپنے ملک ہندوستان کا تعلیمی نظام زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اخبارات میں شائع ہوئے اشتہارات کی مدد سے میں نے سمجھانے کی کوشش کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں صحافت، فوٹو گرافی، دندان کا کورس، آنکھوں کا کورس، مطلب طرح طرح دوسرے فن بھی سیکھے جا سکتے ہیں اور کم ہی وقت میں انسان ماہر فن بن جاتا ہے۔

اقتباس:

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد ونواح سے کسی کا لڑکا بھی ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔ لیکن پھر بھی ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لوہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی اور بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقش کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بے حد موزوں ہے، اس لئے ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں پڑھنے لکھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی۔ لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے، اور فطرت اپنا کام حسن وخوبی کے ساتھ کر سکے۔

سلیس:

میری یہ رائے اس لئے رد کر دی گئی کہ میرے شہر سے باہر کوئی بھی تعلیم کے لئے نہیں گیا تھا اور نہ ہی یہ روایت رہی تھی کہ میرے آس پاس کا کوئی لڑکا علم کے لئے باہر گیا ہو۔ اس لئے میرے شہر کے لوگ باہر کے ملکوں کے حالات سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ مجھ سے کوئی مشورہ نہیں پوچھا گیا اور دو تین لوگوں نے بیٹھ کر مجھے لاہور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب میں نے یہ خبر سنی تو مجھے سخت تکلیف ہوئی لیکن جب میں نے کچھ لوگوں سے بات چیت کی اور لاہور کے حالات کے بارے میں جانا تو معلوم ہوا کہ لاہور اور لندن کے حالات میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں سے مجھے کچھ دوستوں نے سینما اور کچھ نے تھیٹروں کے حالات سے واقف کیا اور کچھ دوستوں نے لاہور کی پرسکون سڑکوں کے مناظر دکھانے کی کوشش کی، بعض نے شاہدرے اور شالامار کی آب وہوا کا نقشہ پیش کیا۔ یہ سب جاننے کے بعد لاہور کا

ایک جغرافیہ میرے دماغ میں بن گیا تھا اور میں نے یہ تصور کرلیا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایسا خوشگوار ماحول زیادہ فائدہ مند رہے گا۔ ہم نے اپنی زندگی کو بامقصد بنانے کے لئے ترکیب سوچی جس زندگی پڑھائی لکھائی ہی کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی لیکن وہ بھی کسی حد تک تا کہ خود پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور ذہن وفکر اپنا کام بخوبی کر سکے۔

اقتباس:

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے، ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن زندگی میں جو ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہئے، وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں، کس کمرے سے کسی کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ پہنچ سکتی، کس دروازے سے کمرے کے کونے میں جھانکنا ناممکن ہے، دروازہ گھر کا کون سارات کے وقت کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا ملازم ناموافق ہے؟ کون سانمک حلال، جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لئے چند گنجائشیں پیدا کرلیں ،لیکن پھر بھی روزانہ دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلباء کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں، ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا: والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں ہے لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا، اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے، اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادئیگی سے نہیں روک سکتی۔

سلیس:

اس طرح سپاہیوں جیسی زندگی مجھے راس نہیں آئی۔ ویسے تو دوستوں سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی، تفریح بھی کر لیا کرتا تھا، ہنسی مزاق کا وقت بھی مل جاتا تھا لیکن زندگی کو خوش اسلوبی کے ساتھ ایک جو آزادی اور فراخی و وارفتگی ہونی چاہیے تھی وہ کبھی نہ حاصل ہوسکی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں گھر کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی کہ ماموں جان کب اور کس وقت گھر سے باہر نکلتے ہیں اور کس کمرے سے کس کمرے تک کتنی آواز پہنچتی ہے، کس دروازے سے کس کمرے میں جھانکا جا سکتا ہے، رات کے وقت کون سا دروازہ کھولا رہتا ہے یا کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا گھر کا نوکر بے وفا ہے،

کون سا نمک حرام ہے ۔جب میں ان تمام باتوں سے میں بخوبی واقف ہوگیا تو اپنی زندگی کو آسان اور خوشی سے گزارنے کے لئے میں نے گنجائش نکال لی لیکن میں پھر بھی اپنے ہاسٹل کے طالب علموں کو دیکھ کر رشک کرتا تھا کہ کس طرح پڑھائی کرتے ہیں ۔ان کو دیکھ کر مجھے آگے بڑھنے میں ہمت پیدا ہوتی گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ماں باپ کی نافرمانی کسی بھی مذہب میں جائز نہیں ہے ۔والدین کی خدمت میں اپنی بے بنیاد خواہش ظاہر کرنا ،ان کی خدمت میں درخواست کرنا ایک کامیاب اولاد کا فرض ہے جس کے لئے مجھے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی روک نہیں سکتی ۔

15.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ پطرس بخاری کے انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کا تعارف بیان کیجئے ۔

2۔ انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کی معنویت کیا ہے؟ ۔

3۔ انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کی سلیس اردو کیجئے ۔

4۔ انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کے حوالے سے کنہیا لال کپور کی انشائیہ نگاری پر نوٹ لکھئے ۔

15.4 امدادی کتب

1۔ اردو انشائیہ ،از سید صفی مرتضی ،نسیم بک ڈپو لکھنو

2۔ انشائیہ کے فنی سروکار (مضامین)،از ڈاکٹر احمد امتیاز ،مرتب ،ناشر ،ایم ۔آر۔پبلی کیشنز ۔نئی دہلی

3۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ ،از پروفیسر نصیر احمد خاں ،ناشر ،اردو اکادمی دہلی ۔

4۔ اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار ایک تجزیاتی مطالعہ ،از ڈاکٹر ہاجرہ بانو ،ناشر عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۔

5۔ انشائیہ کی بنیاد ،از ڈاکٹر سلیم اختر ،ناشر سنگ میل پبلی کیشنز ،لاہور

6۔ انشائیہ کے خدوخال ،از وزیر آغا ،ناشر ،نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی

7۔ انشائیہ کی روایت ،مشرق و مغرب کے تناظر میں ،از محمد اسد اللہ ،ناشر ،جعفر نگر ناگپور ،مہاراشٹرہ

اکائی 16:   رشید احمد صدیقی کا انشائیہ ''گواہ''

16.1 تمہید
16.2 رشید احمد صدیقی کا انشائیہ ''گواہ''
16.2.1   انشائیہ ''گواہ'' کے اقتباسات کا سلیس اردو
16.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات
16.4 امدادی کتب

16.1 تمہید

ایک انشائیہ نگار جس طرح اپنی تمام تر لطافت اور ظرافت، ویژن، دور رس نظر اور اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں ایک بہترین سماجی تاریخ مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح اسی پس منظر میں اگر رشید احمد صدیقی کے انشائیوں کو دیکھا جائے تو زیادہ تر انشائیے علی گڑھ، علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ کی زندگی کا روزمرہ رقم کرتے ہوئے علی گڑھ کی سماجی تاریخ مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی انفرادیت ان کی آشفتہ بیانی میں ہے۔ ان کا اسلوب طنز و مزاح کی شائستگی و شگفتگی سے عبارت ہے۔ معاشرے کی کجی اور بے لاگ تنقید کے عناصر ان کی تحریروں میں اتنے حاوی ہیں کہ ان کے یہاں انشائیہ کا فن مجروح ہو گیا ہے۔ انہیں بڑی سی بڑی بات کو انتہائی جامعیت اور اختصار کے ساتھ کہنے پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی رمز شناسی اور بالغ النظری سے بھی انکار ممکن نہیں۔ ان کے مشہور انشائیوں میں ''چار پائی اور کلچر''، ''الیکشن'' اور ''سفر'' وغیرہ اہم ہیں۔

16.2 رشید احمد صدیقی کا انشائیہ ''گواہ''

گواہ قرب قیامت کی دلیل ہے۔ عدالت سے قیامت تک جس سے مفر نہیں وہ گواہ ہے۔ عدالت مختصر نمونہ قیامت ہے اور قیامت وسیع پیمانہ عدالت۔ فرق یہ ہے کہ عدالت کے گواہ انسان ہوتے ہیں اور قیامت کے گواہ فرشتے جو ہمارے اعمال لکھتے ہیں اور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

عدالت کو قیامت اور قیامت کو عدالت کی جو حیثیت حاصل ہے، وہ گواہ کے دم سے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے آرٹ کو عورت سے ہے، گواہ عینی ہو یا سماعی، روایتی ہو یا پیشہ ور ہر حال میں گواہ ہے۔ اس لئے ہر حال میں خطرناک۔ گواہ جھوٹا ہو یا سچا عدالت کے لئے اس کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا برطانوی اقتدار کے لئے ہندوستان کی دولت اور ہندوستانیوں کی عبادت!

غالبؔ نے انسان کو مختصر خیال قرار دیا ہے۔ ممکن ہے اس کے اسباب میں وہ گواہ بھی ہوں جن کے بیان پر غالبؔ کو اپنے عہد شاعری کا کچھ زمانہ جیل خانہ میں گزارجاتے ہیں۔ گاؤں، تھانہ، بے آبروئی، کچہری، جیل خانہ، جن کے مجموعے کا نام باغیوں نے ہندوستان اور وفا شعاروں نے حکومت رکھا ہے۔

اصول یہ رکھا گیا ہے کہ ہر انسان پیدائشی جھوٹا اور ہر گواہ اصولاً سچا واقعہ کچھ ہو جب تک کوئی گواہ نہ ہو اس کا عدم یا وجود یکساں ہے۔ باعتبار واقعہ ممکن ہے کسی حادثہ کا گواہ نہ ہو لیکن جس طرح فطرت خلا محض سے متنفر ہے اسی طور پر ضابطہ فوجداری سے متعلق جتنے واقعات ہو سکتے ہیں ان کو بھی انتہائی محض سے بیر ہے۔ جس طرح پر خلا کو پر کرنے کے لئے ہوا یا اس کے بعض متعلقات دوڑ پڑتے ہیں اسی طرح ہر موقع واردات پر پولس اور اس کو گواہوں کا پہنچ جانا لازمی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ واردات سے پہلے گواہ پہنچ گئے۔ جیسے کبھی کبھی پالیس واردات کے بعد جائے وقوع پر پہنچنا بہتر سمجھتی ہے۔ قومی تنزل کی مانند گواہ بھی ہر جگہ ملتا ہے۔ اگر قومی تنزل کے انکشاف کے لئے ایک لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے تو گواہ پیدا کرنے کے لئے کسی تھانے دار یا وکیل کا ہونا ضروری ہے۔

بعض مولوی وعظ کہنے سے پہلے ''کلوا واشربوا'' کی خوش آئند توقعات کو پیش نظر رکھتے ہیں اسی طرح ایک تھانے دار یا وکیل کسی واقعہ یا حادثے کی تفتیش شروع کرنے سے پہلے گواہ کے ملنے یا نہ ملنے کے امکان پو غور کرتا ہے اور

ان کے لئے گواہ پیدا کر لینا اکثر اتنا ہی آسان ہوتا ہے جتنا بعضوں کے لئے اولاد پیدا کرنا۔ اولاد کی پرورش یا نگہداشت کی مانند گواہ کا نباہ اور رکھ رکھاؤ بھی بڑا کٹھن کام ہے۔ کھانا، پینا، لباس، تعلیم و تربیت دونوں کے لئے لازمی ہے حادثے کی اہمیت تمام تر گواہ پر منحصر ہے۔ ایک گواہ قتل عمد کو حفاظت خود اختیاری میں اسی آسانی سے تبدیل کرا سکتا ہے جس سے کوئی تنقید نگار بے حیائی کو آرٹ میں، ضرورت اس کی ہے کہ مدعی ذی حیثیت ہو اور حاکم عدالت خطابات کا متمنی اور نو روز یا ملک معظم کی سال گرہ کا منتظر۔

پہلی عالمی جنگ میں دولِ متحارب کا مقولہ تھا آدمی اور سامان جنگ فراہم کر دو ہم دشمن کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔ جیسے یہ کوئی بہت بڑا راز تھا جس کا انکشاف کیا گیا تھا۔ ان کے پیش رو ایک بزرگ ارشمیدس نامی گزرے ہیں ان کا کہنا یہ تھا کہ فلکرم مل جائے تو میں زمین کا تختہ الٹ دوں۔ لیکن ان دونوں کے مقوم علیہ اعظم پولیس والوں کا دعویٰ ہے کہ گواہ فراہم کر دو تو ہندوستان میں نہ ہم کو کمین فروش رہنے دیں گے نہ نان کوآپریٹر۔ ہر بلندی پر یونین جیک ہوگا اور ہر پستی پر سلام علیک!

کسی بات کے حسن و قبح کا مدار زیادہ تر اسی عہد کے ارباب اقتدار کی پسند یا ناپسند پر ہوتا ہے۔ بادشاہ کی مانند متقدر شخص کسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ شاید اس لئے کہ اس پر جرم ثابت کرنے کے لئے گواہ نہیں مل سکتے! ایسا ممکن بھی ہوا تو پھر اس کو جرم کا مرتکب نہیں آرٹ اور کلچر کا مفسر یا محسن قرار دیں گے، پولیس کا کسی کو چالان کر دینا ہی ثبوت جرم کے لئے کافی ہے ہندوستانی عدالت پولیس اور اس کے گواہوں کو وہی اہمیت دیتی ہے جو ہندوستانی عوام ملانوں اوع سیانوں کو دیتے ہیں یعنی دونوں معصوم بھی ہیں، برگزیدہ بھی۔

ہر یورپین پیدائشی فاتح ہے اور ہر ہندوستانی سرکاری گواہ یا اقراری ملزم۔ اس طرح کے گواہ اس مصنف کی مانند ہوتے ہیں جو نازیبا خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے لیکن اس بنا پر قابل مواخذہ قرار دیا جاتا بلکہ لائق تحسین سمجھا جاتا ہے کہ اس نے حقیقت کی ترجمانی کی یا ہندوستان اور ہندوستانیوں کی توہین! سرکاری گواہ کے بارے میں تو آپ جانتے ہوں گے کہ اکثر وہ ایسا مجرم ہوتا ہے جس کے بیان پر دوسرے سزا پاتے ہیں اور خود وہ رہائی پاتا ہے!

جس طرح ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے صرف ایک قوم بنائی گئی ہے اسی طرح گواہ بننے کی صلاحیت ایک طبقے میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ یعنی پٹواری جس گاؤں کا غیر متشدد آمر (ڈکٹیٹر) کہنا بجا ہوگا۔ انگریز کیک کھاتا

اور غراتا ہے۔ پٹوار گالی کھاتا ہے نذارے لیتا ہے اور جو چاہتا ہے درج رجسٹر کرتا رہتا ہے۔ اس کو گاؤں میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو وکیلوں کو عدالت یا کلرکوں کو دفتر میں ہوتی ہے یعنی یہ سب جا چاہیں کر سکتے ہیں بشرطیکہ یہ جو چاہیں وہ ان کو ملتا رہے!

گواہ کی حیثیت سے پٹواری کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اگر یہ مثل صحیح ہے بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ پٹواری کی توہین نہیں کی جاسکتی۔ پٹواری اس راز سے خوب واقف ہے اس کے بعد قومی لیڈر ہی اب تک جان سکا ہے کہ جب تک حلوا مانڈہ ملتا رہے، توہین اور توقیر بے معنی الفاظ ہیں۔ جس طرح ہندوستانی کے لئے شادی اور فاتحہ کشی ناگزیر ہے، پٹواری کے لئے گواہ بننا مقدر ہے۔ اس لئے وہ اپنے میلے بستے کے بہی کھاتوں میں ایسے اندراجات کرتا رہتا ہے۔ ''جو بوقت ضرورت کام آویں'' صوفیانہ کلام یا سیاسی دستاویزات کی مانند اس کے اندر جات ایسے ہوتے ہیں کہ جو چاہے جس طرح تعبیر کرے مواخذے سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور مواخذے میں آ بھی سکتا ہے!

لالہ چرونجی لال گاؤں کے پٹواری اور گنگا دین ایک غریب کسان تھا۔ ایک مقدمے میں گنگا دین کو لالہ جی کی گواہی کی ضرورت پیش آئی۔ گنگا دین کی ساری پونجی ایک گراپڑا جھونپڑا تھا جس کی پردہ پوشی کاشی پھل اور کدو کی ہری ہری بیل، ان کے زرد اور سفید پھول اور صبح شام کی سنہری کرنیں تھیں۔ ایک طرف اُپلوں کا منڈپ تھا۔ دوسری سمت کھاد اور کوڑے کرکٹ کا گڈھا چھپر کے پیچھے کھیت تھا اور سامنے ساگ پات کی کچھ کیاریاں۔ زمیندار کسانوں پر اتنا ہی جری تھا جتنا لالہ چرونجی لال سے خائف۔ گنگا دین کے پاس کچھ مویشیاں بھی تھے جس میں گائے بیل بھیڑ بکری کے ساتھ اس کی بیوی بچے بھی شامل تھے۔

ہندوستانی کسانوں کو دیکھتے ہوئے یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کے بال بچے مویشیاں ہیں یا مویشیاں ان کے بال بچے۔ جب سے مقدمہ شروع ہوا تھا ساری معاش وملکیت لالہ جی کے لئے وقف تھی۔ دودھ دہی ترکاری ان کی رسوئی میں جاتی گنگا دین چلم بھرتا تھا اس کی بیوی للائن کی خدمت گار تھی۔ لڑکے لڑکیاں لالہ جی کے بچوں کو کھلاتے بہلاتے۔ یوں تو ہر پٹواری عدالت کا کیڑا ہوتا ہے جب تک وہ عدالت کی زیارت نہ کرلے اس کی زندگی بے کیف و معنی رہتی ہے لیکن جب سے گنگوا کا مقدمہ شروع ہوا تھا لالہ جی نے عدالت کا ذکر وفکر کم کر دیا تھا۔ گنگوا جب کبھی اس معاملے کو چھیڑتا

تو کہتے بھائی دن برے ہیں۔ تھانہ عدالت سے دور ہی رہنا اچھا۔ پتا جی کا حال تو جانتے ہو کچی بات پر جیل خانہ کاٹنا پڑا کوئی سسرا کام نہ آیا، گنگا دین لالہ کے پاؤں پکڑ لیتا گڑگڑانا شروع کرتا اور جلد جلد ان کے پاؤں دبانے لگتا تو لالہ جی پاؤں ڈھیلے رکھتے لیکن زبان سے ہائیں ہائیں کہتے جس طور پر ڈاکٹر یا وکیل فیس کے لئے جیب ڈھیلی کرتا جاتا ہے لیکن زبان سے کہتا ہے ارے آپ یہ کیا کر رہے ہیں یا اس کی کیا ضرورت تھی۔ لالہ کی نگاہیں گنگوا کی زمین چھپر اور مویشیوں پر تھیں اور گنگوا کی نظروں میں بیوی بچوں کی تباہی کا نقشہ پھر رہا تھا۔ بالآخر لالہ کی فتح ہوئی اور گنگوا دستاویزی غلام بنا کی تاریخ آئی اور دونوں کچہری کو روانہ ہوئے۔

کچہری کا راستہ شہر سے گزرتا تھا چلتے چلتے یکا یک لالہ کے قدم سست پڑنے لگے سامنے جوتے والے کی دکان تھی۔ لالہ جی کھڑے ہو گئے۔ فرمایا جوتا ٹوٹ گیا ہے۔ چلنا پھرنا دوبھر ہے۔ مہنگے سے روز روز شہر آنا نہیں ہو سکتا۔ گنگوا سمجھ گیا۔ اس نے دام ادا کئے لالہ جی نے جوتے قبضے میں کئے۔ دونوں آگے بڑھے۔ کچھ دور چلے تھے کہ بزار کی دکان آ گئی۔ لالہ جی اس طرح رک گئے جیسے جوتے میں کنکری آ گئی ہو جسے اطمینان سے نکالنا چاہتے ہوں۔ بوالے بھائی گنگوا اس پھٹی پرانی پگڑی میں عدالت کے سامنے گئے تو حاکم جلا وے کھڑے کھڑے عدالت سے باہر نکال دے گا۔ تمہارا کام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ گنگوا گھبرایا کہنے لگا لالہ دیر ہو رہی ہے عدالت میں پکار ہونے لگے ہوگی۔ ہرج کیا ہے واپسی میں لے لینا۔

لالہ نے تیوری بدل کر کہا اچھی کہی۔ تمہاری کوڑیوں کی خاطر اپنی لاکھ روپے کی آبرو پر پانی پھر جانے دوں۔ جاؤ نہیں جاتے تو ڈاکٹر گوکل پرشاد سے سٹیفکیٹ لکھوا دیں گے کہ مسمی لالہ چرونجی لال کو ہیضہ ہو گیا اس لئے حاضر عدالت نہ ہو سکا! گنگوا ہیضے کے امکان پر ابھی اچھی طرح خوش نہیں ہو پایا تھا کہ لالہ جی بزار کی دکان کے سامنے تختے پر اس طرح لیٹ گئے جیسے ہیضے میں مبتلا ہو جانے کا اعلان یا انتظار کر رہے ہوں بالآخر پگڑی کا کپڑا خرید لیا گیا!

کچھ اور آگے بڑھے تھے کے حلوائی کی دکان سامنے آئی۔ لالہ کچھ اس طرح رکے جیسے ضروری بات دفعتاً یاد آ گئی ہو۔ فرمایا گنگا دین دیکھو کیسی چوک ہوئی جا رہی تھی درگا جی کی پرشاد لینا بھول گئے کسان تو ہر پرست ہوتا ہے جیسے ہم آپ مطلب پرست ایک طرف اس کی آنکھوں میں پورے کنبہ کی تباہی کا نقشہ پھر گیا دوسری طرف مقدمے کے انجام کا منظر سامنے آیا۔ کچھ نہیں بولا۔ لالہ جی کو سیر بھر جلیبی دلوادی یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ دونوں کچھ دیر تک خاموش چلتے رہے۔

گنگوا اس فکر میں مبتلا کہ لالہ کی سخت گیری کا یہی حال رہا تو دوپہر کے چبینے کے لئے بھی پیسے نہ بچیں گے لالہ اس پھیر میں کہ گنگوا کو اور کس طرح نچوڑا جائے۔

معلوم نہیں گنگوا اُمید یا ناامیدی کی کس منزل میں تھا۔ لالہ کے ذہن میں رسالے جلد ہی کمان و کمیں دونوں متعین کر لئے۔ بولے اس پرویا نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ مہینے بھر سے کٹھیا کا زور ہے تمہارا پیچ نہ ہوتا تو پرمیشر جانے اس حال میں کبھی گھر دوار نہ چھوڑتا۔ یہ کہتے کہتے ایک سایہ دور درخت کے نیچے انگو چھا بچھا کر لیٹ رہے اور اس چلو کا انتظار کرنے لگے جو ایک خوانچہ والا ہے جا رہا تھا۔ خوانچہ والے معزز مہمان کی توجہ کو اپنے لڈو اور مرمر کی طرف مائل کرانا چاہا۔ بولا لالہ کچھ جل کھاوا ہو جائے۔ ایسے سے کدھر آ نکلے ذرا دم لے لو۔

گنگوا کا یہ حال کہ بس چلتا تو لالہ جی خوانچہ والا اور خوانچہ سب کو پاس کے کنوئیں میں ڈھکیل کو خود بھی کود پڑا لیکن بے بسی وہ بلا ہے جو ہر طرح کے غم، غصے اور غرور کو ٹھنڈا کرا دیتی ہے۔ گنگوا نے کہا لالہ جی ہم پر دیا کرو سورج دیوتا کہاں آئے۔ عدالت کب تک پہنچیں گے لالہ نے کراہ کر بے رخی سے جواب دیا۔ بھیا اپنے آپ کی سیوا نہ کریں تو کون بھڑو ابال بچوں کو دیکھے گا۔ تم عدالت جاؤ ہمار تو پران نکلا جات ہے۔ ارے باپ رے۔

خوانچہ والا بولا، لالہ دھیرج دھرو۔ یہ لو چلم پیو۔ کچھ کھا پی لو۔ عدالت میں بیان حلفی داخل کر دینا۔ اس دوران میں ایک خالی یکہ گزرا۔ خوانچہ والا بولا ارے بھائی لالہ جی کا جی اچھا نہیں ہے یکے میں کیوں نہیں بیٹھا لیتا۔ یکہ والا رک گیا۔ لالہ جی نے کروٹ بدلی۔ خوانچہ والے نے لالہ لڈو اور مرمرے کھانے اور ٹھنڈا پانی پینے کی دعوت دی یہ کہتے ہوئے کہ عدالت کا معاملہ ہے معلوم نہیں کب کھانے پینے کی نوبت آئے۔ گنگوا نے چند آنے خوانچہ والے کو نذر کئے لالہ جی یکے والے کی دعوت پہلے سے قبول کر چکے تھے۔ ایک کراہتا دوسرا کوستا دونوں یکے میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

عدالت میں پکار ہوئی۔ لالہ نے پگڑی اور بستہ سنبھالا۔ چپراسی لالہ جی کا آشنا نکال۔ گردن میں ہاتھ دے کر ایک دشنام زیرلبی کے ساتھ جھونکا دیا تو لالہ جی نے موافقت میں گواہی دی نہ مخالفت میں اس دوران عدالت، وکلا، فریقین، چپراسی، حاضرین سب نے باری باری لالہ جی کو اپنی اپنی پسند کی گالیاں دیں۔ طرح طرح سے ڈراتے دھمکاتے رہے لیکن لالہ کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی۔

کچہری برخاست ہوئی۔ لالہ باہر نکلے۔ یکہ والوں کا ہجوم تھا۔ کسی پر ایک سواری تھی وہ دوا اور کی فکر میں تھا۔ کسی

پر دو تھیں وہ ایک کا متلاشی تھا۔ اس دھر پکڑ میں لالہ وارد ہوئے۔ سر پر نئی پگڑی۔ پاؤں میں نیا جوتا۔ ہاتھ میں دن بھر کا سمیٹا ہوا مال غنیمت۔ بغل میں غیر فانی لیکن ناشدنی بستہ، چاروں طرف سے چابک بدست لنگوٹی بند یکہ والوں نے گھیر لیا۔ ایک نے بستہ چھین کر اپنے یکہ پر رکھ لیا۔ دوسرے نے گھڑی اپنے قبضے میں کی۔ تیسرے نے خود لالہ کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا اور کچھ دور تک گھسیٹتا ہوا لے بھی گیا۔ اس رسا خیز میں پگڑی نے سر سے اور جوتے نے پاؤں سے مفارقت کی جن کو دوسرے یکہ بانوں نے بتر کا اپنے اپنے یکوں پر رکھ لیا۔ یہ سب آنکھ جھپکاتے ہو گیا۔

اب جو دیکھتے ہیں تو میدان صاف تھا۔ سارے یکے والے چل دئے تھے اور لالہ جی بیک بینی اور دو گوش اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ دنیا کا آئندہ آشوب کون ہوگا۔ یکہ بان یا پٹواری۔

16.2.1 انشائیہ ''گواہ'' کے اقتباسات کا سلیس اردو

اقتباس:

گواہ قرب قیامت کی دلیل ہے۔ عدالت سے قیامت تک جس سے مفر نہیں وہ گواہ ہے۔ عدالت مختصر نمونہ قیامت ہے اور قیامت وسیع پیمانہ عدالت۔ فرق یہ ہے کہ عدالت کے گواہ انسان ہوتے ہیں اور قیامت کے گواہ فرشتے جو ہمارے اعمال لکھتے ہیں اور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

عدالت کو قیامت اور قیامت کو عدالت کی جو حیثیت حاصل ہے، وہ گواہ کے دم سے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے آرٹ کو عورت سے ہے، گواہ عینی ہو یا سماعی، روایتی ہو یا پیشہ ور ہر حال میں گواہ ہے۔ اس لئے ہر حال میں خطرناک۔ گواہ جھوٹا ہو یا سچا عدالت کے لئے اس کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا برطانوی اقتدار کے لئے ہندوستان کی دولت اور ہندوستانیوں کی عبادت!

غالبؔ نے انسان کو مختصر خیال قرار دیا ہے۔ ممکن ہے اس کے اسباب میں وہ گواہ بھی ہوں جن کے بیان پر غالبؔ کو اپنے عہد شاعری کا کچھ زمانہ جیل خانہ میں گزار جاتے ہیں۔ گاؤں، تھانہ، بے آبروئی، کچہری، جیل خانہ، جن کے مجموعے کا نام باغیوں نے ہندوستان اور وفا شعاروں نے حکومت رکھا ہے۔

حوالہ:

زیر بحث اقتباس رشید احمد صدیقی کے انشائیہ ''گواہ'' سے لیا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں بلا کی مزاح اور طنز موجود ہے جس کی وجہ سے رشید احمد صدیقی کا شمار اردو کے بڑے مزاح نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔

سلیس:

گواہی قیامت کے نزدیک آنے کا ایک ثبوت ہے۔ انسان کو دنیا کی عدالت سے لے کر قیامت تک جس سے چیز سے چھٹکارا حاصل نہیں وہ گواہی ہے۔ دنیا کی عدالت قیامت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے اور قیامت اس سے زیادہ بڑی شکل کی عدالت ہے۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ دنیاوی عدالت کے گواہی دینے والا ایک انسان ہوتا ہے اور قیامت کے دن گواہی دینے والے فرشتے ہوتے ہیں جو ہمارے شب و روز کے گناہ وثواب کو تحریر کرتے ہیں اور خود کو اللہ کی عبادت کرنے میں مصروف رکھتے ہیں۔

عدالت اور قیامت دونوں کو جو حیثیت حاصل ہے وہ صرف گواہی کی بنیاد پر حاصل ہے یعنی گواہی اہم کردار ادا کرتی ہے ورنہ کوئی معنویت نہیں رہ جاتی۔ جس طرح ایک عورت کو آرٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ گواہ کی کئی اقسام ہیں چاہے وہ آنکھوں کی گواہی ہو یا پھر سنی سنائی گواہی ہو، دستور کے مطابق رائج گواہی ہو یا پھر جذبے اور لگن کی گواہی ہو یہ ساری گواہی ایک ہی درجہ رکھتی ہیں اور یہ کسی بھی حال میں بہت اثر انداز ہوتی ہیں۔ اب گواہی دینے والا شخص کتنا ہی جھوٹا یا پھر سچا کیوں نہ ہو لیکن اس کا جو شخص ہے وہ اس طرح ہے کہ جس طرح انگریزوں کے لئے ہندوستان کی دولت اور ان کی عبادت۔

غالبؔ جس نے انسان کی ذات یا انسانی زندگی کو بہت مختصر ثابت کیا ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ غالبؔ کے سامنے کچھ گواہ موجود ہوں اور غالبؔ نے اپنا کلام جو جیل خانے میں کہا شاید اسی کی گواہی کی سزا تھی۔ گاؤں، تھانہ، بے آبروئی، کچہری، اور پھر جیل خانہ، جن کو اکٹھا کر کے بغاوت کرنے والوں نے ہندوستان اور وفا نبھانے والوں نے حکومت نام رکھا۔

اقتباس:

گواہ کی حیثیت سے پٹواری کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اگر یہ مثل صحیح ہے بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ پٹواری کی توہین نہیں کی جاسکتی۔ پٹواری اس راز سے خوب واقف ہے اس کے بعد قومی لیڈر ہی اب تک جان سکا ہے کہ جب تک حلوا مانڈہ ملتا رہے، توہین اور توقیر بے معنی الفاظ ہیں۔ جس طرح ہندوستانی کے لئے شادی اور فاتحہ کشی ناگزیر ہے، پٹواری کے لئے گواہ بننا مقدر ہے۔ اس لئے وہ اپنے میلے بستے کے بہی کھاتوں میں ایسے اندراجات کرتا رہتا ہے۔ ''جو بوقت ضرورت کام آویں'' صوفیانہ کلام یا سیاسی دستاویزات کی مانند اس کے اندر جات ایسے ہوتے ہیں کہ جو چاہے جس طرح تعبیر کرے مواخذے سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور مواخذے میں آ بھی سکتا ہے!

سلیس:

پٹواری ایک اہم مقام رکھتا ہے اور گواہ کے اعتبار سے پٹواری کی اہمیت کو کبھی بھی درگزر نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اگر اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ سے کبھی بھی کوئی چھوٹی سی غلطی بھی سرزد نہیں ہوسکتی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ سچی ہے کہ پٹواری کے بارے میں کوئی غلط بیانی بھی نہیں کرسکتا۔ پٹواری اس بات سے بخوبی واقف ہے اور پٹواری کے بعد ایک قوم کا لیڈر ہی اس بات سے باخبر ہے کہ جب تک میٹھا حلوا کھانے کو ملتا رہے تب تک کسی کی بدخواہی اور کسی کی مروت یہ دونوں لفظ بے معنی ہیں ان کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ جس طرح ہندوستانی معاشرے میں شادی بیاہ اور فاتحہ کہنا لازمی ہے تو اسی طرح ایک پٹواری کا گواہ بننا اس کے نصیب میں ہے۔ اس لئے ایک پٹواری اپنے پرانے پھٹے ہوئے تھیلے اور بستے میں ایسے کاغذات کو محفوظ رکھتا ہے جو کسی بڑی صوفی کی ہدایات کا مقام رکھتے ہیں۔ ان کاغذات کی مدد سے جو جس طرح سے چاہے مطلب پیش کرسکتا ہے۔

16.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیہ ''گواہ'' کا تعارف بیان کیجئے۔

2۔ انشائیہ ''گواہ'' کی معنویت کیا ہے؟۔

3۔ انشائیہ ''گواہ'' کی سلیس اردو کیجیے۔

4۔ انشائیہ ''گواہ'' کے حوالے سے کنہیالال کپور کی انشائیہ نگاری پر نوٹ لکھیے۔

16.4 امدادی کتب

1۔ اردو انشائیہ، از سید صفی مرتضی، نسیم بک ڈپو، لکھنو

2۔ انشائیہ کے فنی سروکار (مضامین)، از ڈاکٹر احمد امتیاز، مرتب، ناشر، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

3۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، از پروفیسر نصیر احمد خاں، ناشر، اردو اکادمی دہلی۔

4۔ اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار ایک تجزیاتی مطالعہ، از ڈاکٹر ہاجرہ بانو، ناشر عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔

5۔ انشائیہ کی بنیاد، از ڈاکٹر سلیم اختر، ناشر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

6۔ انشائیہ کے خدوخال، از وزیر آغا، ناشر، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی

7۔ انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں، از محمد اسد اللہ، ناشر، جعفر نگر ناگپور، مہاراشٹر

اکائی 17:　انشائیہ ''کاہلی'' کا تنقیدی جائزہ

17.1 تمہید
17.2 انشائیہ ''کاہلی'' کا تنقیدی جائزہ
17.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات
17.4 امدادی کتب

17.1 تمہید

سرسید کو اردو نثر کا بانی کہا جاتا ہے انھوں نے اردو نثر کو عبارت آرائی، لفاظی، تکلف وتصنع سے نجات دلائی، سیدھے سادھے انداز میں بات کہنا سکھایا اور اردو زبان میں اتنی قوت اور صلاحیت پیدا کر دی کہ ہر طرح کے مضامین ادا کیے جاسکیں اور علمی موضوعات پر بہ آسانی اظہار خیال کیا جاسکے۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی ہے وہ ہر موضوع اور خیال کے لیے مناسب اسلوب اپناتے ہیں ان کا اسلوب ہر رنگ میں ڈھل جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سرسید احمد خان کا انشائیہ ''کاہلی'' ایک تمثیلی مضمون ہے جو کاہلی کے لفظی معنی کو سمجھانے کو عمدہ مثال ہے۔

17.2 انشائیہ ''کاہلی'' کا تنقیدی جائزہ

''کاہلی'' سرسیّد احمد خان کا ایک عمدہ اور سبق آموز انشائیہ ہے جس میں انھوں نے کاہلی کو موضوع بنا کر قارئین کو یہ بات ذہن نشین کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ کاہلی اصل میں یہ نہیں ہے کہ انسان کام کاج کرنے میں سُستی برتے بل کہ سب سے بڑی کاہلی یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی قوتوں کو بے کار چھوڑ دے، اور جو لوگ ایسا کرنے کے مرتکب

ہوتے ہیں وہ انسان نہیں حیوان صفت بن جاتے ہیں۔ انسان بھی دوسرے حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے اور جب اُس کے دل کی قوتیں سُست ہوجاتی ہیں اور معمول کے کام میں نہیں لائی جاتیں تو وہ حیوانی خصلتوں میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی اندرونی قوتوں کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور انھیں کسی طرح سے بھی بے کار نہ چھوڑے۔

سرسیّد احمد خان اس مختصر سے انشایئے میں اپنے ملک کے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ جب ایک انسان کی اپنی ضروریات اور اخراجات اُسے قمار بازی، تماش بینی اور شراب نوشی کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور ایسے ہی شوق اُس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سرسیّد احمد خان یہ بات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں کو انگلستان کے لوگوں کے مقابلے میں اپنے دل اور عقل کی طاقتوں کا استعمال کرنے کا کم موقع ملتا ہے اور اگر انگریزوں میں محنت اور کوشش کرنے کا شوق نہ رہے تو وہ بھی وحشی بن جائیں گے۔ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے انھوں نے دل اور عقل کی طاقتوں کا استعمال کرنا اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ انھوں نے کاہلی اختیار کی ہے۔ یعنی انھوں نے دل و دماغ کی قوتوں سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اور اگر ہمیں ان قوتوں سے کام لینے کا موقع نہیں مل رہا ہے تو ہمیں اس کی فکر اور کوشش کرنی چاہیے اور اس موقع کو حاصل کرنے کی تلاش میں رہنا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے دل کو بے کار نہ پڑے رہنے دے۔ اُسے یہ بات پلے باندھ لینی چاہیے کہ جب تک ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑے رہنا نہ چھوٹے گا تب تک اس قوم کی بہتری کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔

تحسین و تجزیہ:

''کاہلی'' انشائیہ میں سرسیّد احمد خان نے اپنے ملک کے لوگوں کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ کاہلی سے انسان سست اور بے کار ہوجاتا ہے جس کی بدولت اُسے بہت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ انشائیہ ادب برائے زندگی کا آئینہ دار ہے جسے ایک مقصد کے تحت تحریر کیا گیا ہے۔ یہ انشائیہ اگرچہ مختصر ہے مگر اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ سرسیّد احمد خان نے کاہلی کا جس حسین پیرایئے میں تجزیہ کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ انشائیہ کی زبان

نہایت آسان، سلیس اور سادہ ہے۔ یہ بات بھی قابلِ تعریف ہے کہ مصنف نے اس انشائیے کی وساطت سے اپنے ملک کے لوگوں کو جس غفلت سے آگاہ کرنا چاہا ہے اُسے وہ موثر اور اچھوتے انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سرسیّد کا اسلوب دل کش، انداز بیان دل چسپ اور معیار عمدہ ہے۔ اُن کے طرز تحریر میں سادگی، سچائی، بے باکی، شوخی، سلاست، روانی، دل کشی، رنگینی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اس انشائیے میں کاہلی کی نہایت اچھوتے اور انوکھے انداز میں وضاحت کی ہے اور وہ اصل مقصد کو سمجھانے میں نہایت کامیاب رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ کاہلی سرسیّد احمد خان کی انشائیہ نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

17.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ انشائیہ ''کاہلی'' کا تنقیدی جائزہ اپنی زبان میں لکھیے۔

2۔ انشائیہ ''کاہلی'' کی زبان و بیان پر نوٹ لکھیے

3۔ انشائیہ ''کاہلی'' کے حوالے سے سرسید احمد خان کی ذہانت کے متعلق لکھیے۔

4۔ انشائیہ ''کاہلی'' کی فنی خوبیاں بیان کیجیے۔

17.4 امدادی کتب

1۔ اردو انشائیہ، از سید صفی مرتضیٰ، نسیم بک ڈپو، لکھنو

2۔ انشائیہ کے فنی سروکار (مضامین)، از ڈاکٹر احمد امتیاز، مرتب، ناشر، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

3۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، از پروفیسر نصیر احمد خاں، ناشر، اردو اکادمی دہلی۔

4۔ اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار ایک تجزیاتی مطالعہ، از ڈاکٹر ہاجرہ بانو، ناشر عرشیہ پبلی کیشنز دہلی۔

5۔ انشائیہ کی بنیاد، از ڈاکٹر سلیم اختر، ناشر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

6۔ انشائیہ کے خدوخال، از وزیر آغا، ناشر، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی

7۔ انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں، از محمد اسد اللہ، ناشر، جعفر نگر ناگپور، مہاراشٹر

اکائی 18:　　انشائیہ ''برج بانو'' کا تنقیدی جائزہ

18.1　تمہید

18.2　انشائیہ ''برج بانو'' کا تنقیدی جائزہ

18.3　نمونہ برائے امتحانی سوالات

18.4　امدادی کتب

18.1　تمہید

کنہیا لال کپور بحیثیت پیروڈی نگار مشہور ہیں۔ انھوں نے عمدہ اور معیاری پیروڈی کے نمونے پیش کیے۔ کنہیا لال کپور کے طنز کی اچھی مثال ان کی مشہور پیروڈی ''غالب جدید شعرا کی مجلس میں'' ہے۔ کنہیا لال کپور کے انشائیوں کا مطالعہ کے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کنہیا لال کپور کی دور بین نگاہیں زندگی کے ہر مخصوص شعبے پر پڑتی ہیں۔ سیاسی، معاشرتی، علمی، ادبی خرابیوں کو نہایت حسین اور مزاحیہ انداز میں منظر عام پر لاتے ہیں۔ ان کی تحریر کے تخیل میں فلسفیانہ گہرائی نہیں پائی جاتی۔ وہ کسی جماعت کے نظریہ سے متاثر ہو کر نہیں لکھتے بلکہ ہر بات اور ہر مسئلہ کو اپنے طور پر سمجھتے ہیں اور سماج یا فرد کی خرابیوں کو بے لوث ہو کر پیش کر دیتے ہیں۔ سماج کے کئی کرداروں کی حماقتوں کو بڑی سنجیدگی سے متعارف کراتے ہیں۔ باوجود متانت کے واقعات اور حالات کچھ ایسے سلیقہ سے سامنے لاتے ہیں کہ پڑھنے والا زیر لب مسکراہٹ پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں خود ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ دوسروں کی کمزوریوں کا ماتم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا انشائیہ ''برج بانو'' بھی ایک ایسی ہی زندہ مثال ہے۔

18.2 انشائیہ ''برج بانو'' کا تنقیدی جائزہ

''برج بانو'' کنھیالال کپور کا ایک بہترین انشائیہ ہے جس میں انھوں نے اُردو کی حالت بیان کی ہے۔ اُردو جو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہاں ہی پروان چڑھی۔ یہ یہاں کے عام لوگوں کی زبان ہے۔ وہ لوگ جو قلفی بیچتے ہیں، ڈرائیور ہیں، چنے بیچنے والے یا اخبار فروش ہیں۔ یہ سبھی لوگ اُردو بولتے ہیں، اُردو سے پیار کرتے ہیں اور اس کی چاشنی اور شیرینی کے عاشق ہیں۔ اُردو ہندوستان کی ایسی زبان ہے جس نے یہاں کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو کافی فروغ دیا ہے۔ یہ یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ وہ لوگ انتہائی تنگ نظر ہیں جو اسے مسلمانوں کی زبان صرف اس لیے کہتے ہیں کہ یہ پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔

کپور نے اس انشائیے کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے اور اُردو کو برج بانو نام دیا ہے جس کا باپ مسلمان اور ماں ہندو تھی۔ یہ ہر ہندو اور مسلمان کے گھر میں رہتی ہے، اس سے ہر کوئی پیار کرتا ہے۔ اس کے عاشقوں میں جوان اور بوڑھے سب شامل ہیں۔ رتن ناتھ سرشار اس پر ایسا مرمٹا کہ ساری عمر اسی زبان کے بوسے لیتا رہا۔ تنگ نظر لوگ اسے پاکستان چلے جانے کے لیے کہتے ہیں مگر وہ اپنا وطن ہندوستان کو مانتی ہے اور اس کے ثبوت کے طور پر قلفی بیچنے والوں، ڈرائیوروں، چنے بیچنے والوں اور اخبار فروشوں کو پیش کرتی ہے، جو اپنی روزمرہ بول چال میں لاجواب، شاندار اور بے نظیر جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔

تحسین و تجزیہ:

''برج بانو''، تمثیلی انداز میں کنھیالال کپور کا لکھا ہوا ایک دل چسپ انشائیہ ہے۔ اس انشائیے میں ایک طرف طنز و مزاح کی چاشنی ہے اور دوسری طرف سماجی برائیوں اور تعصب اور تنگ نظری پر بے باکی سے چوٹ کی ہے۔ اس انشائیے میں انشائیہ نگار نے درحقیقت ہندوستان میں اُردو زبان کی حالت بیان کرتے ہوئے یہاں کے متعصب اور تنگ نظر لوگوں کے چہروں سے پردہ ہٹانے کی بے باک کوشش کی ہے۔ کپور نے اُردو زبان کی شیرینی، دل کشی اور عوامی مقبولیت کو موضوع بنا کر انشائیہ کی صنف کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ کپور نے اسے بلاشبہ افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے مگر اُن کی پیش کش قابلِ داد ہے۔ انھوں نے حقیقت بیانی میں جس صاف گوئی اور بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے وہ کپور ہی کا کمال ہے۔ اپنے مقصد کو کامیابی سے ہم کنار کرانے کے لیے انھوں نے طنز و مزاح کا سہارا لیا ہے، جس سے انشائیے کی

اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

کپور کا انشائیہ ''برج بانو'' حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کی زبان سادہ، عام فہم اور شگفتہ ہے۔ اسلوب بیان اگر چہ تمثیلی ہے مگر انتہائی دل کش ہے۔ انھوں نے حالات اور واقعات ایسے انداز میں پیش کیے ہیں کہ متعصب اور تنگ نظر سماج کی تصویر قارئین کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ انھوں نے طنز اور مزاح کی چاشنی استعمال کر کے اُردو زبان سے متعلق ایک بہت بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ اس انشائیے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج ہے اور اسی کی بدولت انھوں نے سماج کی بڑی بڑی حماقتوں اور بدعتوں کا سنجیدگی سے پردہ چاک کیا ہے۔

کنھیا لال کپور کے اس انشائیے کی زبان سادہ اور معیاری ادب کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس انشائیے کی خصوصیت اس کی جامعیت اور اختصار ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں انھوں نے بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں جس سے انشائیے کی وقعت اور عظمت میں اضافہ ہوا ہے۔

18.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ انشائیہ ''برج بانو'' کا تنقیدی جائزہ اپنی زبان میں لکھیے۔

2۔ انشائیہ ''برج بانو'' کی زبان و بیان پر نوٹ لکھیے

3۔ انشائیہ ''برج بانو'' کے حوالے سے کنھیا لال کپور کی انشائیہ نگاری پر روشنی ڈالیے۔

4۔ انشائیہ ''برج بانو'' کی فنی خوبیاں بیان کیجیے۔

18.4 امدادی کتب

1۔ اردو انشائیہ، از سید صفی مرتضیٰ، نسیم بک ڈپو، لکھنو

2۔ انشائیہ کے فنی سروکار (مضامین)، از ڈاکٹر احمد امتیاز، مرتب، ناشر، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

3۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، از پروفیسر نصیر احمد خاں، ناشر، اردو اکادمی دہلی۔

اکائی 19: انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کا تنقیدی جائزہ

19.1 تمہید
19.2 انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کا تنقیدی جائزہ
19.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات
19.4 امدادی کتب

19.1 تمہید

پطرس اردو کے ان ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے بہت کم لکھا لیکن جو بھی لکھا اس کی بدولت ادب عالیہ میں ان کی ساکھ قائم ہوگئی۔ احمد شاہ پطرس بخاری کو اگر عجوبہ روزگار کہا جائے تو کچھ عجب نہ ہوگا۔ ان کے اہم انشائیوں میں ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی'' ''کتے''، ''مرحوم کی یاد میں''، ''مرید پور کا پیر''، ''ہاسٹل میں پڑھنا''، ''لاہور کا جغرافیہ'' وغیرہ ہیں۔ ان کے انداز بیاں، روانی، کردار نگاری، مزاح نے ہر عام و خاص کو متاثر کیا۔

19.2 انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کا تنقیدی جائزہ

''ہاسٹل میں پڑھنا'' پطرس بخاری کا ایک دل چسپ انشائیہ ہے جس میں انھوں نے ایک ایسے طالب علم کا کردار پیش کیا ہے جو انٹرنس پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوتا ہے اور کالج کی تعلیم کے دوران وہ ہوسٹل میں رہنا چاہتا ہے مگر والد صاحب اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے ہیں کیوں کہ اُن کا خیال ہے کہ ہوسٹل میں رہنے والے طلبہ ہر قسم کی برائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ اس کے لیے لاہور میں ایک ماموں دریافت کر کے اُسے اُس کی

سر پرستی میں رکھا جاتا ہے۔

ایک طرف طالب علم ہر سال کی چھٹیوں میں گھر آ کر اپنے والد کو ہوسٹل میں رہنے کے فائدے بیان کر کے وہاں رہنے کی اجازت چاہتا ہے جس کی والد اُسے اجازت نہیں دیتا۔ دوسری طرف وہ ہر سال امتحان میں کسی نہ کسی مضمون میں فیل ہوتا رہتا ہے اور یوں وہ کئی برسوں تک کالج میں پڑھتا رہتا ہے۔ اس کے کچھ ہم عمر تعلیم سے فارغ ہو کر اُسی کالج میں تعینات ہو جاتے ہیں۔ ایک ہم جماعت تو ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بھی بن گیا ہے۔

مسلسل امتحانات دیتے رہنے اور ایک ایک مضمون میں ہر سال کامیابی ملنے سے اُسے اب ایک مضمون پاس کرنا باقی رہ گیا تھا۔ لہذا اب کالج میں اس کے پڑھنے کے لیے صرف ایک سال رہ گیا تھا اور ہوسٹل میں اگر اس سال رہنا نصیب نہ ہوا تو پھر عمر بھر میں کبھی نہ ہوگا۔ اس لیے اب کی بار اُسے ہوسٹل میں رہنے کے سلسلے میں کسی نہ کسی طرح والد سے اجازت مل گئی اور اُس نے اس سلسلے میں ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کو خط بھی لکھ دیا مگر اُس کی بد نصیبی یہ ہوئی کہ اب کی بار وہ فیل ہونے کے بجائے پاس ہو گیا اور اُس کا ہوسٹل میں رہ کر پڑھنے کا ارمان دل میں ہی رہ گیا۔

تحسین و تجزیہ:

''ہاسٹل میں پڑھنا'' پطرس بخاری کا ایک انتہائی دل چسپ انشائیہ ہے جس میں ہلکے پھلکے طنز و مزاح کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ وہ بات سے بات پیدا کرنے کے ماہر ہیں اور معمولی واقعات میں مزاح پیدا کرتے ہیں جس کی عمدہ مثال ''ہاسٹل میں پڑھنا'' انشائیہ ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ہاسٹل میں پڑھنا ایک معمولی بات ہے مگر پطرس بخاری کا کارنامہ یہ ہے کہ اس میں انھوں نے طنز و مزاح کے کئی پہلو تلاش کیے ہیں۔ اس انشائیے میں جہاں ایک نالائق طالب علم کا کردار پیش کیا گیا ہے وہاں اس کی ہوسٹل میں رہنے کی تمنا، کالج اور ہوسٹل کی فضا اور مسلسل ناکام ہونے کے باوجود تعلیم جاری رکھنے کے اُس کے جذبے کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس انشائیے کے مطالعے سے قارئین اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ انشائیہ لکھتے وقت ایک تو فطری انداز اختیار کرتے ہیں اور دوسرے واقعات اور حالات کے بیان میں بھی ایسا اسلوب اپناتے ہیں کہ مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل ہی آتا ہے۔

پطرس ایک ذہین ادیب ہوئے ہیں۔ وہ انشائیے لکھتے وقت بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوتے ہیں بل کہ فطری انداز میں معمولی خیال کو بلند کر دیتے ہیں جس کی بہترین مثال زیرِ بحث انشائیہ ہے۔ ان کے انشائیوں کا پلاٹ خاموشی

کے ساتھ اپنے گردوپیش کے مناظر سے ہم رنگ ہوتا ہوا ارتقا کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے جس پر قاری ہنستا ہے اور غور وخوض بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی ترتیب سے مزاح پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی لیے برجستگی اور ندرّت ان کے انشائیوں کی جان ہے۔ وہ جو کچھ تحریر کرتے ہیں وہ حقائق کا رنگ لیے ہوتا ہے۔ اُن کے پلاٹ اور کردار، سیرت اور منظر نگاری اصل واقعات کی پیش کش ہیں۔ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' ایسے ہی واقعات پر مبنی انشائیہ ہے۔

''ہاسٹل میں پڑھنا'' انشائیے کی زبان بڑی سادہ اور دل چسپ ہے۔ اس میں روانی اور زور کے ساتھ ساتھ دل کشی اور لوچ بھی موجود ہے، اسلوبِ نگارش شگفتہ، خوشگوار اور پرلطف ہے۔ اُن کا مشاہدہ بڑا تیز ہے اِسی لیے اِس انشائیے میں سیرتِ انسانی اور اس کی جزئی باتیں اُبھر کر سامنے آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پطرس بخاری اپنے کرداروں کی کردار نگاری اور سیرت طرازی میں ایک ماہرِ نفسیات کا کمال دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

19.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کا تنقیدی جائزہ اپنی زبان میں لکھیے۔

2۔ انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کی زبان و بیان پر نوٹ لکھیے

3۔ انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کے حوالے سے کنہیالال کپور کی انشائیہ نگاری پر روشنی ڈالیے۔

4۔ انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کی فنی خوبیاں بیان کیجیے۔

19.4 امدادی کتب

1۔ اردو انشائیہ، از سید صفی مرتضیٰ، نسیم بک ڈپو، لکھنو

2۔ انشائیہ کے فنی سروکار (مضامین)، از ڈاکٹر احمد امتیاز، مرتب، ناشر، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

3۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، از پروفیسر نصیر احمد خاں، ناشر، اردو اکادمی دہلی۔

4۔ اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار ایک تجزیاتی مطالعہ، از ڈاکٹر ہاجرہ بانو، ناشر عرشیہ پبلی کیشنز دہلی۔

5۔ انشائیہ کی بنیاد، از ڈاکٹر سلیم اختر، ناشر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

6۔ انشائیہ کے خدوخال، از وزیر آغا، ناشر، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی

اکائی20: انشائیہ کی تعریف اور خصوصیات

20.1 تمہید
20.2 انشائیہ کی تعریف اور خصوصیات
20.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات
20.4 امدادی کتب

20.1 تمہید

انشائیہ کے لغوی معنی "عبارت" کے ہیں۔ انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون کی مانند لگتی ہے مگر مضمون سے الگ انداز رکھتی ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار آزادانہ طور پر اپنی تحریر پیش کرتا ہے، جس میں اس کی شخصیت کا پہلو نظر آتا ہے۔ اور بغیر کسی خاص نتیجہ کے بات کو ختم کرتا ہے، یعنی نتیجہ کو قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔

تعریف:

اُردو میں انشائیہ انگریزی لفظ ایسے ESSAY کے معنوں میں استعمال کی گئی ایک نئی اصطلاح ہے۔ ابتدا میں ''ایسے'' کے لیے اُردو میں ''مضمون'' کا لفظ استعمال ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک مضمون کا تعلق ہے اس زُمرے میں مذہبی، سیاسی اور سماجی سے لے کر علمی، ادبی اور تحقیقی سب طرح کے مضامین آجاتے ہیں لیکن انھیں ادبی مقام نہیں دیا جاسکتا۔ ایسے مضامین میں معلومات فراہم کرنے پر زور دیا جاتا ہے جب کہ انشائیہ کا مقصد معلومات فراہم کرنے کی بجائے ادبی تخلیق ہوتا ہے۔ اس میں علم وحکمت کی باتیں ہوتی ہیں۔ غور وفکر کے دامن کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں چھوڑا

جاتا۔ ذہنی فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور سنجیدگی پہلی اور آخری شرط ہے۔ اس میں بات کہنے کے انداز سے زیادہ بات کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ انشائیہ میں انسان اپنے تجربے اپنے انداز سے بیان کرتا ہے۔ انشائیہ میں بھی ادب کے اصولوں کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے لیکن ادب کے دوسرے اصولوں کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے آداب اور اصول بھی ہوتے ہیں۔ یہ ایک بے تکلف محفل کی حیثیت رکھتا ہے جہاں انسان اپنے دل کی بات مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ انشائیے میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ انشائیہ نگار کو مکمل آزادی ہے کہ وہ جس موضوع پر بات کرنا چاہے، کھل کر بات کر سکتا ہے۔ چناں چہ وہ انشائیے میں زندگی کے بڑے اور گہرے تجربات نہایت ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرتا ہے۔

انشائیہ نثر کی ایک نازک صنف ہے۔ یہ کسی قسم کی قید یا پابندی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے کسی افسانوی ڈھانچے، پلاٹ، کردار نگاری، نقطۂ نظر اور پس منظر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انشائیہ نگار ان سب باتوں سے بالاتر ہو کر زندگی کے حقائق بڑے خوب صورت اور پُر معنی انداز میں سامنے لاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کہیں کہیں ہلکے پھلکے طنز و مزاح سے بھی کام لیتا ہے لیکن بعض اوقات طنز و مزاح کی بھرمار اسے مجروح کر سکتی ہے۔

انشائیہ نگار زندگی کا نقاد بھی ہوتا ہے اور مبصر بھی۔ وہ انشائیے کے ذریعے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے اسی لیے انشائیہ ایک قسم کی ذاتی تحریر ہے جس میں مصنف کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ چوں کہ اُس کی شخصیت ماحول کی پروردہ ہوتی ہے اس لیے انشائیے میں مصنف کے ماحول اور عہد کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ہر انشائیہ اپنے لیے اپنے اصول خود متعین کرتا ہے جس میں رنگا رنگی، تنوع، اور خیالات کی نُدرت ہوتی ہے۔ انشائیے میں تخیل کی بلندی اور خیالات کا لطیف ہونا ضروری ہے۔ یہ مختصر، ہلکی پھلکی اور بامقصد ادبی تحریر ہوتی ہے۔

انشائیہ کی خصوصیات:

جہاں تک انشائیے کی خصوصیات کا تعلق ہے یہ ایک بامقصد ادبی تحریر ہے۔ اختصار اس کا حسن ہے، جامعیت اس کا اصول اور انفرادیت اس کی اوّلین شرط ہے۔ انشائیہ جہاں انشائیہ نگار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے وہاں یہ اپنے عہد اور مصنف کے ماحول کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ اس کی زبان عام فہم اور سادہ ہوتی ہے۔ اس میں تنوع اور رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ خیالات کی نُدرت بھی ہوتی ہے۔ یہ نثر کا ایسا شاہکار ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی موضوع کو لے کر اُس

میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے جس کی بدولت یہ زندگی کے نقاد اور مبصر کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔اس صنف میں زندگی بغیر تصنع اور بناوٹ کے نظر آتی ہے۔ یہ ایک طرح کی ذاتی تحریر ہوتی ہے جس میں حکمت سے حماقت تک اور حماقت سے حکمت تک کی ساری منزلیں طے ہوتی ہیں۔اس کی تخلیق آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ گویا یہ تلوار کی دھار پر چلنے کا کام ہے جس کے لیے سنجیدگی پہلی اور آخری شرط ہے۔ ہلکا پھلکا طنز و مزاح اس کے لیے چاشنی کا کام دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ انشائیہ کا فن غزل گوئی کے فن کی طرح ہوتا ہے جہاں غزل کے ہر شعر میں ایک جداگانہ مضمون اور خیال ہوتا ہے۔یہ غزل کے اشعار کی طرح بظاہر جدا مگر بہ باطن باہم مربوط ہوتا ہے۔اس کے پڑھنے کے بعد قاری یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ع میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اُردو ادب میں اگر ہم انگریزی انشائیوں کا معیار ذہن میں رکھ کر انشائیہ کا تجزیہ تحریر کریں تو معلوم ہوگا کہ اُردو میں انشائیے کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔لیکن اس صنف سے ملتی جلتی کچھ تحریریں ہمیں اُردو نثر کے ابتدائی نمونے ہمیں ملا وجہی کی ''سب رس'' میں ملتے ہیں۔اُس کے بعد میر محمد حسین عطا خان تحسینؔ کی مشہور تصنیف ''نوطرزِ مرصع'' میں بھی انشائیہ کی مثالیں ملتی ہیں۔انشائیہ کے کچھ نکھرے ہوئے نمونے ہمیں رجب علی بیگ سرور کی تصنیف ''فسانۂ عجائب'' میں بھی ملتے ہیں۔اسے اُردو ادب میں انشائیہ نگاری کا ابتدائی دور کہا جا سکتا ہے۔انگریزی زبان کے انشائیوں کے معیار کی جھلکیاں ہمیں جن ادیبوں کی تحریروں میں بدرجہ اتم ملتی ہیں ان کے نام اس طرح سے ہیں: مرزا غالبؔ، محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، مولوی ذکا اللہ، سرسیّد احمد خان، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوشؔ، نیازؔ فتح پوری، عبدالحلیم شررؔ، مہدی افادی، سجاد انصاری، ملا رموزی، ناصر علی، حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، مولانا ابوالکلام آزادؔ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کرشن چندر، کنھیا لال کپور، نظیر صدیقی، شوکت تھانوی، فرقت کاکوروی، قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر عابد حسین اور احمد جمال پاشا۔

اُردو کے ابتدائی انشائیہ نگاروں میں غالبؔ اور مولانا محمد حسین آزادؔ کا نام اس لیے لیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں نے شعوری طور پر انشائیہ تحریر کرنے کی اگرچہ کوشش نہیں کی ہے مگر اُن کا اسلوب اس صنف کے بہت قریب ہے۔ غالبؔ کی نثر میں ان کا شخصی انداز اور دل کی بات کہنے کی تڑپ انھیں ایک اعلیٰ انشا پرداز بنا دیتی ہے۔ جب کہ مولانا محمد حسین

آزادؔ کے ''نیرنگِ خیال'' کے مضامین اگرچہ تمثیلی ہیں مگر وہ انشائیہ کے ابتدائی نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔اُن کے مضامین میں خارجیت کا عنصر نمایاں ہے اور غالبؔ کے یہاں سرتاپا داخلیت ہے۔

اُردو میں انشائیہ نگاری کا حقیقی معنوں میں سرسیّد احمد خان کے انشائیوں سے آغاز ہوتا ہے۔ان کے انشائیوں میں ''بحث وتکرار''، ''امید خوشی''، ''عمرِ رفتہ'' اور ''کاہلی'' انشائیہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔مولوی ذکاءاللہ کے مضمون ''ہوا'' میں انشائیہ کی خصوصیات ملتی ہیں۔مولانا الطاف حسین حالیؔ کے ''زمانہ'' اور ''زبان گویا'' کو اُردو انشائیوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔سجاد حیدر یلدرم کا ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ''، فرحت اللہ بیگ کا ''یار باش، صاحب بہادر''، ملا رموزی کا لیچے مضمون، سلطان حیدر جوشؔ کا ''آج اور کل'' اور نیاز فتح پوری کا ''برسات'' قابلِ مطالعہ انشائیے ہیں۔

بیسویں صدی میں اُردو کے جن انشا پردازوں نے اپنے قلم کا لوہا منوایا اُن میں شرر، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، سجاد انصاری، حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، وزیر آغا اور کنہیالال کپور کے نام خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔انھوں نے اپنی تحریروں کو زیادہ تر طنز ومزاح سے مزین کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں انشائیہ اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا ''مچھر''، پطرس بخاری کا ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی''، ''ہاسٹل میں پڑھنا''، شوکت تھانوی کا ''منہ پھٹ آئینہ''، رشید احمد صدیقی کا ''شیخ پیرو پاسباں''، وزیر آغا کا ''پگڈنڈی'' اور کنہیالال کپور کا ''برج بانو'' اعلیٰ پایہ کے انشائیے ہیں۔ان انشائیہ نگاروں کے علاوہ موجودہ زمانے میں اس صنف پر غیر معمولی توجہ دی جا رہی ہے اور اس صنف نے ادب اور اُردو ادب میں باقاعدہ طور پر اپنی جگہ بنالی ہے کیوں کہ یہ صنف زندگی کے مسائل کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے لیے انتہائی موزوں ہے۔

20.3 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ انشائیہ کی تعریف وخصوصیات کیا ہے؟

2۔ انشائیہ اور مضمون میں فرق واضح کیجئے۔

3۔ انشائیہ کی پہچان کیا ہے۔

4۔ انشائیہ کے لوازمات کیا ہیں

20.4 امدادی کتب

1۔ اردو انشائیہ، از سید صفی مرتضیٰ، نسیم بک ڈپو لکھنو

2۔ انشائیہ کے فنی سروکار (مضامین)، از ڈاکٹر احمد امتیاز، مرتب، ناشر، ایم۔آر۔ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

3۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ، از پروفیسر نصیر احمد خاں، ناشر، اردو اکادمی دہلی۔

4۔ اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار ایک تجزیاتی مطالعہ، از ڈاکٹر ہاجرہ بانو، ناشر عرشیہ پبلی کیشنز دہلی۔

5۔ انشائیہ کی بنیاد، از ڈاکٹر سلیم اختر، ناشر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

6۔ انشائیہ کے خدوخال، از وزیر آغا، ناشر نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی

حالاتِ زندگی:

سیّد احمد خان نام، تخلص آہی اور سر خطاب تھا۔ وہ ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر متقی اور والدہ کا نام عزیز النسا بیگم تھا۔ والد کی طرف سے وہ سیّد تھے۔ والدہ کا خاندان میر دردؔ سے تعلق رکھتا تھا۔ سر سیّد کی والدہ ایک تعلیم یافتہ، پاک سیرت، نیک دل اور دانش مند خاتون تھیں۔ سر سیّد کی تعلیم و تربیت میں والدہ کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ سر سیّد اور ان کے بزرگوں کو شاہی دربار میں کافی اثر و رسوخ حاصل تھا لیکن انھوں نے درباری تعلق کے بجائے سرکاری ملازمت کو پسند کیا۔ چناں چہ ملازمت سر رشتہ داری سے شروع کی اور صدر امین کے عہدے تک ترقی پائی۔

سر سیّد کے زمانے کے دستور کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر ہی پائی اور پھر صرف و نحو، منطق اور فلسفہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ ان کے علمی اور ادبی شوق کو غالبؔ، شیفتہؔ، آزردہؔ، صہبائی اور مومنؔ جیسی باکمال ہستیوں نے مزید جلا بخشی اور انھیں علم و ادب سے ایک خاص شغف پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران اپنی پہلی اور مشہور کتاب ''آثار الصنادید'' تحریر کی جس میں دہلی کے آثار قدیمہ، علما، فضلا اور شعرا کا ذکر ہے۔ ۱۸۵۵ء جب سر سیّد بجنور تبدیل ہو کر آئے تو وہاں کے قیام کے دوران انھوں نے ''تاریخ بجنور'' لکھی اور ''آئینِ اکبری'' کی تصحیح بھی کی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران انھوں نے انگریزوں کی جانیں بچائیں جس کے صلے میں انھیں جاگیر پیش کی گئی۔ جسے انھوں نے لینے سے انکار کیا۔ اسی دور میں انھوں نے ''رسالۂ بغاوتِ ہند'' لکھ کر یہ ثابت کیا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہندوستانیوں کا کوئی ہاتھ نہ تھا بل کہ یہ انگریزوں کی اپنی غلطی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں سر سیّد کا تبادلہ غازی پور ہو گیا جہاں انھوں نے اسی سال سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ چلے گئے جہاں سے اُنھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' نکالا جس کا مقصد ہندوستان کے عوام کو جدید علوم و فنون سے روشناس کرانا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں سر سیّد احمد خان لندن گئے جہاں انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کا مشاہدہ کیا اور وہیں ان کے دل میں یہ

خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان میں اسی طرز کا ایک علمی اور ادبی مرکز قائم کیا جائے۔ اسی دوران انھوں نے ایک انگریز سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' میں سیرتِ پاک اور اسلام پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کے جواب میں ایک مدلّل اور سنجیدہ کتاب تحریر کی جو ''خطباتِ احمدیہ'' کے عنوان سے اُردو میں شائع ہوئی۔ ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آکر انھوں نے اپنا مشہور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا اور ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی جو بعد میں ہائی اسکول اور پھر کالج بنا۔ آج یہی مدرسہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی صورت میں سرسیّد کے خواب کی تعبیر بن کر ہمارے سامنے موجود ہے۔ ۱۸۷۶ء میں سرسیّد نے پنشن لی اور بقیہ عمر ملک، قوم، زبان و ادب اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی خدمت میں صرف کی۔ ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسیّد نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور انھیں علی گڑھ کالج کی جامع مسجد کے احاطے میں سپردِ خاک کیا گیا۔

ادبی خدمات:

سرسیّد احمد خاں اُن یادگارِ زمانہ بڑی ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے زمانے میں ملک و قوم اور زبان و ادب کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ وہ مصلحِ اعظم بھی تھے، قومی مدبر اور ماہرِ تعلیم بھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اُردو زبان کے صاحبِ طرز انشا پرداز بھی تھے۔ وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے بے عمل لوگوں کو عمل کا درس دیا۔ جدید علوم و فنون کی اہمیت کا احساس دلایا اور خوابِ غفلت سے جگا کر ایک روشن مستقبل کی ڈگر پر گامزن کیا۔ انھوں نے اپنے رفقا کے ساتھ مل کر اُردو زبان اور ادب میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ یہ اُن کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں تھیں کہ اُردو میں سرسیّد یا علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا جس سے اُردو زبان و ادب کو کافی فروغ ملا۔ یہ سرسیّد کا زبان و ادب کے سلسلے میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے اپنے ساتھ ایسے رفقا شامل کر لیے تھے جن میں سے ہر فرد ادبی دُنیا میں ایک خاص مقام اور مرتبہ رکھتا ہے۔ ان رفقا میں سے چند اہم کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ نواب مہدی علی خاں، نواب قادر الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالؔی، علامہ شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد اور محسن الملک۔

سرسیّد نے اُردو زبان و ادب کے ذخیرے میں اپنی جن اہم تصانیف سے اضافہ کیا وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔جامِ جم ۲۔آ ثارالصنادید ۳۔خطباتِ احمدیہ ۴۔رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند
۵۔تاریخِ سرکشی بجنور ۶۔تفسیرِ احمدی وغیرہ۔

انشائیہ نگاری:

سرسیّد احمد خان پہلے شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے صاف، سلیس اور عام فہم زبان میں علمی و ادبی مضامین اور کتابیں لکھیں۔ ان کی تحریروں میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں ہے بل کہ یہ سادہ اور عام فہم ہیں۔ انھوں نے مشکل سے مشکل اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین انتہائی سادہ اور سلیس زبان میں لکھ کر شہرت حاصل کی۔ انھوں نے اصلاحی، مذہبی، سماجی، معاشرتی اور تعلیمی موضوعات پر مضامین لکھ کر قوم کو نئے خیالات سے روشناس کیا۔ اُن کے بعض مضامین کو ہم انشائیوں کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں جن کی بدولت وہ اُردو کے پہلے انشائیہ نگار شمار ہوتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں بحث و تکرار، امید و خوشی، عمرِ رفتہ اور کاہلی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں فکر و تخیل، منطق و فلسفہ، جوش و خروش، شوخی و ظرافت اور حقیقت نگاری پائی جاتی ہے۔ اُن کے مضامین اور انشائیوں کی نثر سادہ، صاف اور آسان ہے۔ ان کا طرزِ تحریر واضح اور پُر زور ہے۔ قوتِ بیان انتہائی متاثر کُن ہے۔ زبان میں سلاست، روانی، سادگی اور عبارت میں دل کشی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ درحقیقت اُن کی تحریروں کا اصل جوہر سچائی، سادگی، بے باکی، شیرینی اور شوخیٔ بیان ہے۔ اُن کی نثر صنائع بدائع اور تشبیہات اور استعارات سے پاک ہے۔ اُن کی تحریروں کی بدولت اُس کے عہد کے نثر نگاروں کے اسلوبِ نگارش میں اہم تبدیلی آئی اور عام فہم، سادہ، سلیس اور آسان طرزِ تحریر کی طرف توجہ دی جانے لگی۔ اُردو انشائیہ کی صنف کو فروغ دینے والوں میں سرسیّد احمد خان کا نام سرِ فہرست ہے۔

اکائی 22:　محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری

محمد حسین نام اور آزاد تخلص تھا۔ ۱۸۲۹ء میں آزاد دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ جنھوں نے دہلی کا پہلا اخبار ''اُردو اخبار'' کے نام سے ۱۸۳۷ء میں نکالا۔ آزاد کے والد ایک بلند پایہ عالم اور نیک سیرت بزرگ تھے جن کی آغوش میں آزاد نے تربیت پائی۔ زمانے کے دستور کے مطابق انھوں نے ابتدائی تعلیم شیخ محمد ابراہیم ذوق سے حاصل کی۔ ذوق کے انتقال کے بعد آغا جان عیش نے اُن کی تربیت کی۔ اُس کے بعد اُنھوں نے قدیم دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے قتل کے الزام میں آزاد کے والد کو سزائے موت دی گئی جس سے آزاد کو بہت صدمہ ہوا اور وہ گھر چھوڑ کر تلاشِ معاش میں سرگرداں لاہور پہنچے۔ جہاں انھیں ۱۸۶۴ء میں تعلیم کے محکمے میں ملازمت ملی۔ ۱۸۶۵ء میں آزاد نے کابل، بخارا اور ایران کا سفر کیا۔ ۱۸۸۳ء میں وہ جب دوبارہ ایران گئے تو اُنھوں نے وہاں جدید فارسی زبان میں کافی مہارت حاصل کی۔ ۱۸۸۷ء میں آزاد کو سرکار کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔

ملازمت کے دوران محکمۂ تعلیمات کے ڈائریکٹر میجر فُلر آزاد سے بہت متاثر تھے لہٰذا فُلر نے آزاد کو درسی کتابیں لکھنے پر مامور کیا۔ میجر فُلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر بنے جس نے آزاد کو ایک سرکاری اخبار ''اتالیق'' کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا۔ جب ''پنجاب میگزین'' جاری ہوا تو آزاد اُس کے بھی سب ایڈیٹر رہے۔ کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں آزاد نے ۱۸۷۴ء میں ''بزمِ مشاعرہ'' قائم کی اور جدید اُردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔ آزاد ایک عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے۔

۱۸۸۹ء میں آزاد کے دماغ میں جنون کا مرض پیدا ہوا اور ساتھ ہی جوان بیٹی کا انتقال بھی ہوا جس سے وہ بُری طرح سے متاثر ہوئے۔ چناں چہ ۱۹۱۰ء میں آزاد کا انتقال ہوا اور وہ لاہور ہی میں سپردِ خاک کیے گئے۔

ادبی خدمات:

آزاد جدید اُردو نظم کے بانی بھی تھے اور ایک صاحبِ طرز انشا پرداز بھی۔ ایک مورخ بھی اور محقق بھی۔ اُردو

ادب کی دونوں اصناف یعنی نظم اور نثر پر انھیں یکساں عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اُردو اور فارسی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ''آبِ حیات'' ہے جو اُردو ادب کی پہلی باقاعدہ تاریخ ہے۔ اس کتاب میں اُردو ادب کی تاریخ کا ایک صحیح راستہ متعین کیا گیا ہے جس سے اُردو میں تنقید کے فن کا آغاز ہوا۔ اُردو ادب کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام کرتی رہے گی۔

آزاؔد نے انگریزی اور یونانی ادب سے متاثر ہو کر ایسے اخلاقی مضامین تحریر کیے جن سے اُردو ادب میں تمثیل نگاری کی صنف کو کافی فروغ ملا۔ ''نیرنگِ خیال'' آزاؔد کے ایسے ہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ''سخندانِ فارس'' علمِ زبان پر لکھی ہوئی اُن کی ایک اہم کتاب ہے۔ اسی طرح ''دربارِ اکبری'' اکبر کے عہد کی تاریخ ان کا ایک مقبول کارنامہ ہے۔ اُردو ادب کے دامن کو آزاؔد نے اپنی ان مندرجہ ذیل کتابوں سے مالا مال کیا ہے۔

۱۔ آبِ حیات ۲۔ نیرنگِ خیال ۳۔ دربارِ اکبری ۴۔ سخندانِ فارس ۵۔ نگارستانِ فارس ۶۔ دیوانِ ذوق ۷۔ نظمِ آزاؔد ۸۔ سیرِ ایران ۹۔ قصصِ ہند۔ ان کے علاوہ بھی نثر و نظم میں آزاؔد کی متعدد تصانیف ہیں۔

انشائیہ نگاری:

آزاؔد کو چوں کہ اُردو نثر و نظم پر یکساں دسترس تھی چناں چہ انھوں نے اپنے زورِ قلم سے نثر و نظم دونوں کو یکساں طور پر سیراب کیا ہے۔ وہ جہاں ایک شاعر ہونے کی وجہ سے جدید اُردو نظم کے بانی تھے۔ وہاں ایک صاحبِ طرز انشا پرداز کی حیثیت سے ایک بلند مرتبے کے حامل بھی تھے۔ ''نیرنگِ خیال'' کے مضامین اُن کی تمثیل نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری کے بھی اعلیٰ مرقعے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاؔد کا طرزِ تحریر نہایت دل کش ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور دروبست، محاورات کی صحت اور تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال آزاؔد کی نثر خاص طور پر انشائیہ نگاری کی نمایاں خوبی ہے۔ وہ اپنے طرزِ تحریر میں منفرد مقام کے مالک تھے۔ انشا پردازی کا یہ طرز جو انھوں نے شروع کیا تھا انھیں پر ختم ہو گیا۔ ان کے انشائیوں میں عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ اور دور از کار تشبیہات، صنائع اور بدائع کا استعمال نہیں ہے۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور بے تکلفی انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کا حُسن ہے۔

آزادؔ کی انشائیہ نگاری کا سارا حُسن اُن کے دل کش طرزِ تحریر میں ہے۔ وہ قلم کے جادوگر ہیں۔ وہ لکھتے وقت الفاظ کے انتخاب سے حقائق اور واقعات کی ایسی منظر کشی کرتے ہیں کہ نثر میں بھی شعر کا سا درد واثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن کی طبیعت میں نازک خیالی، لطافت اور موزونیت خداداد تھی۔ یہی خصوصیات اُن کی انشائیہ نگاری کا طرۂ امتیاز ہیں اور ''نیرنگِ خیال'' کے تمام انشائیے اور مضامین انھی اوصاف کے حامل ہیں۔ زبان کی سلاست بیان کی لطافت اور محاوروں کی بندش اور چُستی اُن کی نثر میں شعریت پیدا کرتی ہے۔

آزادؔ ایک باکمال انشائیہ نگار اور جدید نظم و نثر کے بانی تھے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں اُن کا نام ہمیشہ سرِ فہرست رہے گا۔

اکائی 23:   کنہیالال کپور کی انشائیہ نگاری

حالاتِ زندگی:

کنھیا لال نام اور کپور ذات ہے۔ انھوں نے علمی اور ادبی حلقوں میں کنھیا لال کپور کے ہی نام سے شہرت پائی۔ اُن کے والد کا نام لالہ ہری رام کپور تھا۔ جو محکمۂ مال میں پٹواری تھے۔ کپور ۲۷/جون ۱۹۱۰ء کو پاکستان کے ضلع لائل پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان ۱۹۲۸ء کمالیہ سے پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ ڈی.اے.وی کالج لاہور سے پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر ایک مدت تک روزگار کی تلاش میں رہے۔ آخر ڈی.اے.وی کالج میں ملازمت مل گئی۔

مُلک کی تقسیم کے بعد وہ ہندوستان آئے اور فیروز پور میں رہائش اختیار کی۔ یہاں وہ ڈی ایم کالج موگا میں ملازم ہوئے اور وہیں سے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

ادبی خدمات:

کنھیال لال کپور اُردو کے مشہور طنز و مزاح نگار ہیں۔ زندگی اور معاشرہ اُن کے مخصوص موضوعات ہیں۔ وہ سیاسی، معاشی، معاشرتی، علمی، ادبی اور زندگی کے دوسرے مسائل کو نہایت مزاحیہ انداز میں منظرِ عام پر لاتے ہیں اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ قاری کو ان سے متعارف کراتے ہیں۔ وہ حالات و واقعات کو اس انداز سے سامنے لاتے ہیں کہ پڑھنے والا زیرِ لب مسکراہٹ پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کنھیالال کپور نے انشائیے، مضامین اور افسانے لکھے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں خود ہنستے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں بل کہ وہ سماج، اس کے اشخاص اور رجحانات کی کمزوریوں اور خرابیوں کا ماتم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اس اسلوب کی شوخی اور بے باکی کی فضا میں ایسی لہر دوڑا دیتی ہے جو سمجھنے والے کو بار بار گدگداتی اور چھیڑتی چلی جاتی ہے۔ ان کی تحریروں میں ایک تنوع اور دل آویزی پائی جاتی ہے۔

کنھیال لال کپور کے مضامین انشائیوں اور افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سنگ و خشت،

چنگ ورباب، نوک ونشتر، شیشہ وتیشہ، نرم وگرم اور بال وپر خاص ہیں۔ کپور کا انتقال ۱۹۸۱ء میں ہوا۔

انشائیہ نگاری:

کنھیال لال کپور نے طنزیہ اور مزاحیہ افسانے، مضامین اور انشایئے لکھے ہیں اور وہ اُردو ادب میں ایک طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں معاشرے کی اصلاح کا مقصد لیے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی اور سادگی ہے۔ ان کے مضامین، افسانے اور انشایئے پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بے تکلف باتیں کررہا ہو۔ تحریروں کے ظاہر میں سنجیدگی مگر باطن میں نشتر اور مزاح کارفرما رہتا ہے۔ اُنھوں نے محض ہنسنے ہنسانے کے لیے نہیں لکھا ہے بل کہ بغیر فلسفیانہ انداز اختیار کیے سماج کے غلط میلانات ونظریات اور طور طریقوں کو عوام اور قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے تاکہ پڑھنے والا اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔

کنھیال لال کپور کا شمار ترقی پسند ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے اسی لیے اُن کی تحریروں میں سماج اور زندگی کے مختلف مسائل پر بڑی متاثر کن تنقید ملتی ہے۔ اُن کی کردار نگاری بھی بڑی مؤثر ہے۔ طرزِ بیان شوخ اور دل چسپ ہے۔ مضامین میں رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ اپنے مضامین میں انھوں نے ایک معمولی واقعہ یا بات اس انداز سے پیش کی ہے کہ وہ دل چسپ اور توجہ کا باعث بن گئی ہے۔

جہاں تک کنھیال لال کپور کی زبان کا تعلق ہے اُن کی زبان ٹکسالی اُردو کا نمونہ ہے۔ اُن کی تحریریں ادبیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ جملوں میں جہاں جہاں بھی جامعیت اور روانی ہم آہنگ ہوگئی ہے وہ تحریر ادب کا بہترین حصّہ بن گئی ہے۔ اُن کی تحریریں سپاٹ، سیدھی اور بغیر کسی الجھن کے ہیں۔ جس کی وجہ سے مقصد اور مفہوم سمجھنے میں کوئی دِقت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی بات تشبیہوں اور استعاروں کے سہارے نہیں کہتے بل کہ وہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں صاف اور برجستہ کہہ دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ سادہ زبان استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کا طرزِ بیاں بھی دل کش ہے۔ طنز ومزاح کا جو انداز انھوں نے اپنی تحریروں میں اختیار کیا ہے۔ وہ ان کے انشائیوں کی ایک امتیازی شان ہے۔ طنز ومزاح کے حامل ان کے انشایئے اُردو ادب کے سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہیں۔

اکائی 24: پطرس بکاری کی انشائیہ نگاری

حالاتِ زندگی:

پطرس بخاری کا اصلی نام سید احمد شاہ بخاری تھا۔ ان کے والد کا نام سید اسد اللہ شاہ بخاری تھا۔ سید احمد شاہ بخاری نے جب مضامین لکھنے شروع کیے تو اپنا قلمی نام پطرس رکھا۔ چناں چہ ادبی دُنیا میں وہ پطرس بخاری کے نام سے مشہور ہوئے۔

پطرس بخاری یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ لاہور آئے، جہاں گورنمنٹ کالج لاہور سے انھوں نے انگریزی میں امتیاز کے ساتھ ایم.اے کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ ہونے کے بعد پطرس لندن گئے اور کیمبرج یونی ورسٹی میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ جس طرح گورنمنٹ کالج لاہور میں وہ اپنی ذہانت اور لیاقت کی وجہ سے اساتذہ اور طلبا کی نظروں میں عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے اُسی طرح کیمبرج کے اساتذہ اور طلبا بھی ان کی قدر کرتے تھے۔ ولایت سے واپس آنے کے بعد پہلے وہ ٹریننگ کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر تعینات ہوئے۔

۱۹۳۷ء میں جب آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ قائم ہوا تو گورنمنٹ نے پطرس بخاری کو اسسٹنٹ کنٹرولر کی حیثیت سے محکمہ میں بلا لیا جہاں ۱۹۴۰ء میں وہ ترقی کر کے کنٹرولر جنرل ہو گئے۔ ریڈیو کے محکمے سے وہ سات سال تک وابستہ رہے۔ قیامِ پاکستان سے کچھ قبل وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اُس دوران اُنھیں سرکاری نمائندے کی حیثیت سے اکثر بین الاقوامی کانفرنسوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ ۱۹۵۵ء میں انھیں اقوامِ متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ اس عہدے پر وہ پہلے ایشیائی تھے۔ ۵/دسمبر ۱۹۵۷ء کی صبح کو پطرس بخاری کا نیویارک میں انتقال ہو گیا۔

ادبی خدمات:

پطرس انگریزی کے ادیب تھے مگر دوستوں کی صحبت کے زیرِ اثر اور اُن کے اصرار پر انھوں نے اُردو میں

مزاحیہ افسانے اور انشائیے لکھنا شروع کیے اور بہت کم عرصہ میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کے انشائیوں اور مضامین کا مجموعہ ''پطرس کے مضامین'' کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں صرف گیارہ مضامین ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ مضامین رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں مگر یہ مختصر سے مضامین پطرس کی شہرت کا باعث ہیں۔ ان مضامین کی بدولت انھوں نے اُردو ادب میں اچھے لکھنے والوں میں اپنے لیے ایک اعلیٰ مقام بنا لیا ہے۔ پطرس کے ان مضامین میں ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی''، ''کتے''، ''زید پور کا پیر'' اور ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کافی مشہور ہیں۔

انشائیہ نگاری:

پطرس بخاری مغربی ادبیات سے پوری طرح واقف تھے چناں چہ انھوں نے اُردو میں جو کچھ بھی لکھا اس میں اُن تمام لطافتوں اور نزاکتوں کا اظہار کیا جو مغربی ادب میں موجود تھا۔ پطرس نے اُردو طنز و مزاح کو ایک نئی جہت عطا کی۔ وہ اپنے مضامین میں ہنسنے ہنسانے کی کوشش نہیں کرتے بل کہ وہ واقعات کے تسلسل اور کرداروں کے حرکات و سکنات کو فطری طور پر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اُن سے خود بخود مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔ ان کے مضامین کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا نہیں بل کہ طنز اور مزاح کے ذریعے سے وہ اصلاح کا کوئی نکتہ مدِ نظر رکھتے ہوئے علمی اور ادبی خدمات انجام دینا چاہتے ہیں۔

''پطرس کے مضامین'' کے مجموعہ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ان کے مضامین میں خیالات کی بلندی اور فکر میں گہرائی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کردار نگاری اور سیرت نگاری میں ایک ماہر نفسیات کا کمال دکھایا ہے۔ ان کے کردار اپنے فطری انداز میں سب کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کو خبر نہیں ہوتی کہ اُن کی حرکتوں کا اثر دوسروں پر کیا پڑ رہا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے حرکات و سکنات، رفتار و گفتار، ہر ایک بات کے بیان میں نفسیاتی مشاہدے کا ثبوت دیتے ہیں۔ اُن کے کردار ارتقا کے اصول کی پابندی پر کاربند نظر آتے ہیں۔

پطرس کے مضامین افسانوں، انشائیوں اور خاکوں کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی زبان صاف ستھری اور شگفتہ ہے۔ اُن کے انشائیے پلاٹ کا گورکھ دھندہ نہیں ہیں۔ کوئی معمولی سی بات جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی ترتیب سے اُن کی تحریر ایسا وجود اختیار کر لیتی ہے کہ اُس میں خود بخود مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن کی برجستگی اور ندرت

ایک سیدھی سی بات کو بھی ہنسنے ہنسانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔اُن کی زبان سادہ اور دل چسپ ہے۔بعض جگہ پنجابی محاورات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ان کے انشائیوں میں زبان کی روانی اور زور کے ساتھ ساتھ ایک لوچ اور دل کشی بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں تک اُن کے اسلوب یا طرزِ تحریر کا تعلق ہے یہ زبان کی تمام لطافتوں سے بھر پور ہے۔تحریر کی شگفتگی نے معمولی باتوں میں بھی جان ڈال دی ہے۔ان کے مضامین میں انسانی سیرت کا بہت گہرا نفسیاتی مطالعہ ملتا ہے۔

پطرس بہت ہی ذہین وفطین ادیب تھے۔ وہ ایک ایسے مزاح نگار تھے جنھوں نے سیدھے سادے الفاظ میں بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں۔اُردو مزاح نگاری میں وہ ایک منفرد اور بلند مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنے مضامین اور انشائیوں سے اُردو انشائیہ نگاری کو ایک نئی سمت عطا کی ہے۔

اکائی 25: رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری

حالاتِ زندگی:

رشید احمد صدیقی جون پور کے ایک گاؤں مڑیاہوں کے رہنے والے تھے، جہاں وہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ آئے۔ چوں کہ گھر کی مالی حالت اچھی نہ تھی اس لیے تعلیم جاری رکھنے کے لیے انھیں چھٹیوں میں کچہری میں کلرکی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ علی گڑھ سے ایم۔اے پاس کرنے کے بعد وہ ۱۹۲۲ء میں وہیں ملازم ہوگئے۔ مسلم یونی ورسٹی میں جب شعبۂ اُردو قائم ہوا تو وہ اس شعبے سے وابستہ ہوگئے جہاں وہ صدر رہے اور پھر پروفیسر ہوکر اس عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ یونی ورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ علی گڑھ میں تقریباً خانہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے اور یہیں ۱۹۷۷ء میں اُنھوں نے انتقال کیا۔

ادبی خدمات:

رشید احمد صدیقی کی طبیعت طالب علمی کے زمانہ سے ہی انشا پردازی کی طرف مائل تھی اور انھوں نے اُسی زمانہ میں اپنی انشا پردازی کا سکّہ بٹھا دیا تھا اور اپنے مخصوص انداز کی بنا پر اُن کی انشا پردازی اُن کی انفرادیت کی ضامن ہوگئی تھی۔

رشید احمد صدیقی ایسے پروفیسر تھے جنھوں نے نہ صرف ادیب اور محقق پیدا کیے بل کہ انھوں نے خود بھی ادب کی بےلوث خدمت کی ہے اور ایک ممتاز اور بلند مقام حاصل کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین اور انشائیوں میں طنز سے بہت کام لیا ہے۔ حالاں کہ طنز ایک مشکل صنفِ ادب ہے اور ذرا سی لغزش سے مضمون تباہ ہو جاتا ہے مگر رشید احمد اُردو کے واحد طنز نگار ہیں جنھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا رنگ سب سے جداگانہ قائم کیا ہے۔ ان کے یہاں ایک طرح کی شستہ ظرافت ہے۔

رشید احمد صدیقی ایک محقق، ناقد، خاکہ نگار اور انشا پرداز تھے۔ انھوں نے "طنزیات ومضحکات" اور "جدید اُردو غزل" لکھ کر اُردو کے تنقیدی سرمایے میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ رنگ میں "گنج ہائے گراں مایہ"

اور ''خنداں'' نام کے انشائیوں اور خاکوں کے ان کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ''ہم نفسانِ رفتہ''، ''ذاکر صاحب'' اور ''مضامینِ رشید'' بھی اُن کی قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ آخری عمر میں اُنھوں نے ''آشفتہ بیانی میری'' کے نام سے اپنی ایک سوانح عمری بھی تحریر کی ہے۔

انشائیہ نگاری:

رشید احمد صدیقی اُردو کے ایک ممتاز اور منفرد انشاپرداز تھے۔ انھوں نے اُردو ادب کے دامن کو طنز و مزاح کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ وہ اُردو ادب کے ایک صاحبِ طرز مزاح اور طنز نگار تھے۔ طنز میں اُن کا ایک طرز ہے جس کے وہ خود خالق تھے اور وہ طرز ان ہی پر ختم ہوگیا۔ ان کے انشائیوں میں طنز و مزاح کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں جس طرح کے رمز و کنایہ سے کام لیتے ہیں ان میں تنقید کے دشوار گزار مراحل کو طے کر لینا رشید احمد صدیقی کا ہی کام ہے۔ کسی واقعہ کے بارے میں وہ اپنے ذاتی جذبات و احساسات طنزیاتی انداز میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ پڑھنے والا انھیں مذاق سمجھ کر ٹال نہیں سکتا۔ وہ کانٹوں کی طرح قاری کے دامن سے اُلجھ کر اپنا اثر پیدا کر ہی لیتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے۔ وہ اپنے خاکوں اور انشائیوں میں جن مخصوص واقعات اور مسائل کی طرف لطیف اشارے کرتے ہیں اُن سے وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو تاریخ اور سیاسیات سے واقف ہیں۔ اُن کے خیالات کی دُور رسی، گہرائی اور نزاکت عام مذاق سے علیحدہ ہوتی ہے۔ ان کے مضامین اور انشائیے اُن کی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ خواہ ''ارہر کا کھیت'' یا ''پاسبان'' جیسے انشائیے کیوں نہ ہوں لیکن وہ انھیں اسمبلی یا پارلیمنٹ اور دنیا یا عقبیٰ کے دوش بدوش دکھا سکتے ہیں اور قاری کا ذہن مطالعہ کے وقت کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے انشائیوں کی زبان مشکل عربی اور فارسی الفاظ لیے ہوئے ہوتی ہے۔ ان انشائیوں کی عبارت اپنے خیال کی بلندی اور الفاظ کی ترتیب کی وجہ سے عام فہم نہیں ہے۔ لیکن روانی اور شگفتگی ہر حصے میں نظر آتی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ عام قاری ان کی تحریروں سے لطف اندوز نہیں ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اُن کے مضامین میں علی گڑھ کا مقامی رنگ ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ دوسرے لوگ

اس سے لطف حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے فکر وفن کا محور علی گڑھ ہے۔ ان کے یہاں جس طرح کا طنز پایا جاتا ہے اُس میں زہرنا کی نہیں ہے اور نہ ہی تلخی ہے۔ ان میں ایک مخصوص انداز کی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ چھوٹے چھوٹے فقرے استعمال کرتے ہیں۔ چناں چہ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں میں موجودہ طنز و مزاح سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک شائستہ ذہن اور شستہ مذاق کی ضرورت ہے۔ عامیانہ پن نہ اُن کی زندگی میں ہے نہ ان کے فن میں۔

رشید احمد صدیقی نے ''مضامینِ رشید'' اور ''خنداں'' میں بعض اہم شخصیات کا ذکر ایسے دل چسپ انداز میں کیا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہنستی بولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ موضوع دل چسپ ہونے کے باوجود عبارت میں شگفتگی کی وجہ سے قاری کا جی نہیں گھبراتا۔ مختصر یہ کہ رشید احمد صدیقی ایک ایسے اہم انشائیہ نگار تھے جن کے انشائیوں کی بدولت اس صنف کو ایک نئی جہت ملی ہے۔

اکائی 26: انشائیہ ''کاہلی'' کا خلاصہ

''کاہلی'' سرسیّد احمد خان کا ایک مختصر مگر اہم انشائیہ ہے۔ اس انشائیے میں سرسیّد احمد خان نے ''کاہلی'' لفظ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان کو کاہل نہیں ہونا چاہیے۔ اُن کا کہنا ہے کہ کاہلی ایک ایسا لفظ ہے جس کا لوگوں نے غلط مطلب سمجھ لیا ہے۔ انسان کا ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج اور محنت مزدوری میں چُستی نہ کرنا یا اُٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں سُستی کرنا کاہلی نہیں ہے بل کہ سب سے بڑی کاہلی یہ ہے کہ انسان اپنے دل اور دماغ کو کام میں لانے کا عمل چھوڑ دے۔ وہ لوگ جنھیں محنت مزدوری کر کے اپنے لیے گزر بسر کا سامان مہیا کرنا ہوتا ہے کم کاہل ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قوی یعنی دل کی طاقتوں کو بے کار چھوڑ دیتے ہیں اور حیوانوں کی طرح کاہل ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے لکھتے ہیں اور ہزاروں میں سے شاید ایک شخص کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی تعلیم اور عقل کو ضروری کام میں لائے لیکن اگر وہ عارضی ضرورتوں کے انتظار میں رہ کر اپنے دل کو بے کار بنا دے تو وہ ایک کاہل اور جنگلی بن جاتا ہے کیوں کہ انسان بنیادی طور پر ایک حیوان ہے اور جب اس کے دل کی قوتیں سُست ہو کر کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں تو وہ حیوانی عادتوں میں پڑ جاتا ہے۔ چناں چہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی اندرونی طاقتوں کو بے کار نہ چھوڑے اور انھیں زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے۔

ایک شخص جس کی آمدنی اُس کی ضرورت کے مطابق ہو اور جس کے حاصل کرنے میں اُسے زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑے اور وہ اپنی دل کی قوتوں کو بھی بے کار ڈال دے تو اس کا لازمی نتیجا یہ ہوگا کہ اُس کے عام شوق وحشیانہ ہو جائیں گے۔ وہ شراب نوشی، مزیدار پکوانوں، قمار بازی، تماش بینی اور دوسری ایسی باتوں کا عادی ہو جائے گا جو اُس کے وحشی اور جنگلی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں۔ دونوں میں فرق صرف سلیقے اور طریقے کا ہوگا۔ ایک کو شراب پی کر پلنگ پر پڑ کر پیچوان کے دھواں اُڑانا پسند ہے، دوسرے کو جنگل کی ریت پر پڑے ناریل میں دھوئیں اڑانا پسند ہے۔ لہٰذا دونوں کی عادتوں میں کوئی فرق اور کمی نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں لوگوں کے لیے ایسے کام بہت کم ہیں جن میں انھیں دل اور عقل کی طاقتیں کام میں لانے کا موقع ملے۔ اس کے برخلاف انگلستان میں لوگوں کے لیے ایسے بہت سے مواقع ہیں اور اگر وہ لوگ محنت اور کوشش کرنا چھوڑ دیں تو وہ بھی بہت جلد وحشی اور جنگلی بن جائیں گے۔ اس لیے ہم اپنے ہم وطنوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ہمیں جو دل اور عقل کی طاقتوں کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے اور دل کے قوت کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہمیں قوتِ قلبی اور قوتِ عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہمیں اس کی فکر اور کوشش کرنی چاہیے کہ ایسا کرنے کا موقع کس طرح حاصل ہو اور اگر اس کی وجہ اور قصور ہو تو اُسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لہذا کسی کے دل کو بے کار نہیں پڑا رہنا چاہیے اُسے کسی نہ کسی بات کی فکر اور کوشش میں رہنا چاہیے تاکہ ہم اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں ہر وقت تیار رہیں۔ جب تک ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑے رہنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہمیں اپنی قوم کی بہتری کی کوئی توقع نہیں ہے کیوں کہ دل اور دماغ کی کاہلی سب سے خطرناک ہے اس کی وجہ سے سارا جسمانی نظام بے کار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ بے کار بیٹھے رہنے سے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا بہتر ہے۔

سوالات :-

۱۔ بقول سر سید احمد خان اگر انسان دل کی قوتوں کو بے کار چھوڑ دے تو وہ کیا بن جاتا ہے۔

۲۔ ہندوستان کے لوگ بھی دل اور عقل کی طاقتوں کا استعمال کریں تو وہ بھی.....................بن سکتے ہیں۔

زندہ قوم۔ مردہ قوم۔ وحشی قوم۔

۳۔ اگر انگریز قوم بھی دل اور عقل کی طاقتوں کا استعمال کرنا بند کر دے تو وہ.....................بن سکتی ہے۔

مردہ قوم۔ زندہ قوم

۴۔ انشائیہ ''کاہلی'' سر سید احمد خان نے کس مقصد کے تحت لکھا ہے۔ مختصر تبصرہ کیجئے۔

اکائی 27:   انشائیہ ''برج بانو'' کا خلاصہ

''برج بانو'' کنہیالال کپور کا ایک بہترین انشائیہ ہے جس میں انھوں نے اُردو زبان کی تشکیل اور ہندوستان اور پاکستان کی عوامی زبان کی بات کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ برج بانو کے عنوان سے جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ برج بانو کی کہانی ہے۔ وہ کون ہے؟ آج کل کہاں رہ رہی ہے؟ اس کے اس عجیب وغریب نام کی وجہ کیا ہے؟ ان سوالات کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی کوشش کی جائے گی کہ برج بانو سے واقفیت کرائی جائے۔ برج بانو ایک خوب صورت عورت ہے جو پاکستان سے ہندوستان آئی ہے۔ اُسے اغوا نہیں کیا گیا ہے بل کہ مجھے اُس سے محبت ہے اور وہ میرے گھر میں رہ رہی ہے۔ اس کا نام برج بانو اس لیے ہے کہ اُس کی ماں ہندو اور باپ مسلمان تھا۔ اگر آپ کو اس بات پر یقین نہیں ہے تو ایک بزرگ سے پوچھ لیں جسے اس کی پیدائش کے سب حالات معلوم ہیں۔ وہ بھی برج بانو سے پیار کرتے ہیں۔ اس کی باتوں میں ایسی کشش ہے کہ جو بھی اس کی باتیں سنتا ہے۔ وہ دل وجان سے اس کا عاشق ہو جاتا ہے۔ آپ میری مثال لیجیے۔ مجھے تیس برس کی عمر میں اس سے عشق ہو گیا تھا۔ حالاں کہ یہ عمر عشق کے لیے بالکل نامناسب ہے۔ لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ یہ صرف میری بات نہیں ہے بل کہ لکھنؤ کا رہنے والا رتن ناتھ سرشارؔ اس عورت کی زبان پر ایسا عاشق ہوا کہ ساری عمر اُسی کا ہو کر رہ گیا۔ اُس کی شان میں ایک ایسی رباعی کہی جس کا ہر مصرع پانچ سو صفحات کا تھا۔

برج بانو پاکستان سے آنے کے بعد چند دنوں سے اداس سی ہے کیوں کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ صرف اُسی سے نہیں بل کہ مجھ سے بھی۔ میرے ہمسایہ ایک لمبی چوٹی والے پنڈت ہیں انھیں اعتراض ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسی عورت کیوں رہتی ہے جس کا باپ مسلمان تھا۔ میرے دوست بھی اس کے میرے ساتھ رہنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے واپس پاکستان بھیج دو۔ وہ لوگوں کی ایسی باتیں سن کر بہت تنگ آ چکی ہے۔
میں نے بھی ایک دن اُسے پاکستان جانے کے لیے کہا۔ اُس نے وجہ پوچھی۔ میں نے اس کے باپ کے مسلمان ہونے کی وجہ بتائی۔ اُس نے ماں کے ہندو ہونے کی بات کی۔ مگر میں نے کہا کہ یہاں ولدیت کے معاملے میں ماں کو کوئی نہیں

پوچھتا۔اس بات پر وہ مایوس ہوگئی۔ میں نے کہا کہ تمہیں یہاں سے اوشیہ چلے جانا ہوگا۔اوشیہ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اور جب میں نے اُسے سمجھایا کہ ہندی میں ضرور کو اوشیہ کہتے ہیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ اُس کی نانی بھی ضرور کو اوشیہ کہا کرتی تھی مگر میں یہ لفظ نہیں کہہ سکتی۔ کیوں کہ میری زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔اس پر میں نے کہا کہ اسی لیے تمہیں ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔مگر وہ غصے میں کہتی ہے کہ ہندوستان میرا گھر ہے۔میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ پاکستان کو میں نے فتح کیا ہے۔ میرا اصلی وطن ہندوستان ہے۔ میں دلی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بچپن جھونپڑی اور جوانی لال قلعے میں گزری۔ ہندوستان کے بادشاہوں نے مجھے اپنایا اور سب سے اونچا درجہ دیا۔ میرے حسن کے سامنے کوئی نہیں ٹِک سکا۔اس لیے میں ہندوستانی ہوں۔

برج بانو اپنے ہندوستانی ہونے اور عوام کی زبان کے ساتھ جُڑے رہنے کے سلسلے میں قلفی والے کی بے نظیر، لاجواب، شاندار قلفی، سکھ ڈرائیور کی لاری پر اُردو میں لکھے شعر اور چنا زور گرم بیچنے والے کی آوازوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ محسوس کراتی ہے کہ اُس کی زبان بولنے والے ہندوستان میں ہیں لیکن اخبار کی یہ سُرخی کہ ''برج بانو اب ہندوستان میں نہ رہ سکے گی'' دیکھ کر وہ مایوس ہو جاتی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہارے ہندوستان سے چلے جانے کا فیصلہ حکومت نے کر دیا ہے۔لیکن وہ کہتی ہے کہ حکومت قانون بنا سکتی ہے عوام کے جذبات کو بدل نہیں سکتی کیوں کہ ''جب تک ہندوستان میں قلفی والے، سکھ ڈرائیور اور چنا زور گرم بیچنے والے موجود ہیں حکومت میرا بال بیکا نہیں کر سکتی۔'' مختصر یہ کہ جب تک ہندوستان کے عام لوگ جیسے قلفی والے، ڈرائیور، چنا زور گرم بیچنے والے یا دوسرے کاروباری لوگ اُردو بولتے رہیں گے تب تک برج بانو یعنی اُردو کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

سوالات:-

۱۔ کنھیا لال کپور کے انشائیے ''برج بانو'' کا خلاصہ تنقیدی تحسین کے ساتھ پیش کریں۔

۲۔ ''برج بانو'' میں کنھیا لال کپور نے اس انشائیے کے ذریعے متعصب اور تنگ نظر سماج کے ایک زبان کے تئیں رویے کو بیان کیا ہے۔آپ اس خیال سے کس حد تک متفق ہیں تفصیل سے اپنے تاثرات پیش کریں۔

اکائی 28: انشائیہ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کا خلاصہ

''ہاسٹل میں پڑھنا'' پطرس بخاری کا ایک عمدہ اور قابلِ مطالعہ انشائیہ ہے جس میں انھوں نے ایک طالب علم کے بی۔اے پاس کرنے میں برس ہا برس گزارنے اور ہاسٹل میں رہنے کی والدین سے صرف ایک بار اجازت ملنے کو موضوع بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب ہم نے انٹرنس پاس کیا اور مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مبارک باد دینے آئے تو گھر والوں کو یہ محسوس ہوا کہ ہمارا بیٹا بہت ہی قابل ہے۔ لہذا ہماری آئندہ کی تعلیم کے بارے میں غور ہونے لگا۔ یونی ورسٹی تھرڈ ڈویژن پاس ہونے والوں کو وظیفہ دینا مناسب نہیں سمجھتی اور ہم نے خاندان میں روپیہ کافی ہونے کی وجہ سے وظیفہ لینا مناسب نہیں سمجھا چناں چہ فیصلہ ہوا کہ تعلیم جاری رکھی جائے۔ اس سلسلے میں ہم سے بھی مشورہ لیا گیا اور ہم نے ولایت کی تعلیم کی حمایت کی جہاں بیک وقت مختلف علوم وفنون سیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر ہماری اس تجویز کو اس لیے رد کیا گیا کہ ہمارے شہر میں یہ روایت نہ تھی۔ لہذا والد صاحب، ہیڈ ماسٹر اور تحصیلدار صاحب نے مل کر ہمیں لاہور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ شروع میں اس بات سے مایوسی ہوئی مگر بعد میں وہاں کے حالات جان کر ثابت ہوا کہ یہ خوشگوار مقام ہے۔ تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ لڑکے کو ہاسٹل میں نہ رکھا جائے کیوں کہ ہاسٹل میں رہنے والوں کی عادتیں خراب ہو جاتی ہیں۔ اس کے بارے میں کافی سوچ وچار ہوا اور لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے جن کو ہمارا سرپرست بنایا گیا۔ اُس کی وجہ سے علم حاصل کرنے کا وہ جوش جو ہمارے دل میں اُٹھ رہا تھا کچھ بیٹھ سا گیا۔ کیوں کہ ماموں والدین سے بھی زیادہ خیال رکھیں گے اور ہوا بھی یہی۔ میرے ہر کام اور میری ہر حرکت پر ماموں کی نظر رہنے لگی۔ زندگی میں جو آزادی ہونی چاہیے تھی وہ نصیب نہ تھی اس لیے ہم نے بھی ماموں اور اُن کے گھر کے ماحول پر غور کرنا شروع کیا اور اپنے لیے کچھ گنجائشیں پیدا کرلیں۔ لیکن ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کی زندگی پر رشک کرتے رہے۔ ہم والدین کی نافرمانی نہیں کرنا چاہتے تھے مگر ہمیں اُن کی خدمت میں اپنی رائے کا اظہار کرنے سے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ چناں چہ گرمیوں کی چھٹیوں میں وطن واپس آکر ہاسٹل کی زندگی، وہاں کی سختی اور دوسری باتوں کے بارے میں بڑی اثر پیدا کرنے والی تقریریں تیار کیں لیکن گھر والوں پر اُن کا کوئی اثر نہ ہوا۔

چھٹیاں ختم ہوئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلے سال کی چھٹیوں میں ہم نے پھر ہاسٹل میں رہنے کے سلسلے میں لیکچر تیار کیا اور کہا کہ ایک طالب علم کی شخصیت ہاسٹل میں رہے بغیر نامکمل رہ جاتی ہے۔ والد صاحب کے ساتھ اس بارے میں بات ہوئی مگر ہم شخصیت اور سیرت میں فرق بیان نہ کر سکے اور پھر وہی ہوا کہ ہم دوبارہ ماموں کے گھر میں رہنے لگے۔ اگلے سال کی چھٹیوں میں شخصیت اور سیرت چھوڑ کر ہاسٹل کی نظم وضبط والی زندگی کی وکالت کی، پروفیسروں سے ملاقاتوں کا ذکر کیا اور اثر ورسوخ بڑھنے کی بات کی مگر ہر بار ہماری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد ہم سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں کمی آ گئی اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی وہ ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ ہمیں تشریف لے جانے کا حکم دیتے۔ والد کے اس سلوک سے میرے لیے اُن کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی البتہ یہ ہوا کہ گھر میں ہمارا اقتدار کم ہو گیا۔

جہاں تک ہماری کالج کی پڑھائی کا تعلق ہے ہم ایف. اے پاس ہو گئے۔ یعنی ریاضی میں کمپارٹمنٹ آئی۔ بی. اے میں تو پہلی مرتبہ بالکل فیل ہو گئے۔ پھر کئی برسوں تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ کبھی ایک مضمون میں فیل تو کبھی دوسرے میں۔ پہلی دفعہ تین میں دوسری دفعہ دو میں، تیسری مرتبہ ایک میں اور یوں ساتویں بار امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ گھر میں آنے کے بعد ہم نے حسبِ دستور فیل ہونے کی پیشن گوئی کر دی کہ بس یہ اب آخری مرتبہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشن گوئی کرنے کی ضرورت نہ ہو گی۔ ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اب کالج میں صرف ایک سال رہ گیا ہے۔ اس دفعہ اگر ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو پھر کبھی بھی موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ اس لیے ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیے۔ چناں چہ ہاسٹل کے سلسلے میں آخری درخواست کرنے سے پہلے اس سلسلے میں تمام تفصیلات احتیاط سے اکٹھا کر لیں۔ پروفیسر جو میرے ہم عصر تھے اُن سے والد کو خط لکھوائے، ہاسٹل کے طلبا کی خوبیاں بیان کیں کہ کالج کا کوئی بھی انعام اور تمغہ ہاسٹل کے طلبا کے علاوہ کسی کو نہیں ملتا۔ بعض کامیاب والدین کے طلبا سے بھی خط لکھوائے اور ہمارے والد کا ہاسٹل کے بارے میں رویہ نرم پڑ گیا۔ پھر بھی وہ یہ سوچنے لگے کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔ اس کے جواب میں ہم نے کہا کہ ہاسٹل میں ایک ایسی علمی فضا ہوتی ہے جو ارسطو اور

افلاطون کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں۔ وہاں ہر طرف طلبا تاریخ، فلسفہ، ریاضی اور دوسرے علوم کی باتیں کرتے ہیں جن کو انگریزی ادب کا شوق ہے وہ رات کو شیکسپیئر کی طرح آپس میں باتیں کرتے ہیں۔

یہ باتیں سُن کر والد صاحب نے ہاسٹل میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اب ہمیں نتیجا آنے اور اپنے فیل ہونے کا انتظار تھا۔ اس دوران ہم نے اُن تمام دوستوں کو خطوط لکھے جن کے اگلے سال پھر ملنے کی اُمید تھی۔ ہم نے انھیں یہ خبر بھی سنائی کہ آئندہ سال کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا کیوں کہ ہم تعلیمی زندگی کے بے شمار تجربات کے ساتھ ہاسٹل میں آ رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ہاسٹل میں ہماری حیثیت مادر مہربان کی سی ہوگی جس کے اِرد گرد نا تجربہ کار طلبا مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ ہم نے ہاسٹل میں رہنے کے دوران ہم پر فلاں فلاں پابندی نہیں ہوگی اور آپ ہمارا فلاں فلاں باتوں میں خیال رکھیں گے۔ لیکن ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ جب نتیجا نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔ چناں چہ پاس ہونے سے ہم پر جو ظلم ہوا سو ہوا، یونی ورسٹی بھی ہماری طرف سے ہر سال ملنے والی خاص آمدنی سے محروم ہو گئی۔

سوالات:

۱۔ پطرس بخاری کے انشائیے ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کا خلاصہ تنقیدی تحسین کے ساتھ پیش کریں۔

۲۔ ''ہاسٹل میں پڑھنا'' میں پطرس بخاری نے کس بات کو مزاح کے انداز میں پیش کیا ہے۔

۳۔ اس انشائیے میں طالب علم کو کون سی آرزو ہے جو پوری ہونے سے رہ جاتی ہے اور کس وجہ سے۔

۴۔ پطرس بخاری کس سن میں اور کہاں پر پیدا ہوئے۔

۵۔ آپ کی تعلیم کن اداروں میں ہوئی اور آپ کہاں کہاں حصولِ تعلیم کے لیے گئے؟

۶۔ آپ نے کس ادارے سے درس وتدریس کا کام شروع کیا؟

۷۔ بیرون ملک کس یونی ورسٹی سے آپ نے اعلیٰ ڈگری حاصل کی؟

۸۔ آپ کا انتقال کس سن میں اور کہاں پر ہوا؟

۹۔ آپ ملکی سطح پر کن عہدوں پر فائز رہے؟

۱۰۔ آپ بیرون ملک کن عہدوں پر فائز رہے؟

۱۱۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ آپ انگریزی ادیب تھے۔ اُردو میں آپ انشائیے اور مضامین کے کس مجموعے سے مشہور ہوئے۔

۱۲۔ پطرس کے وہ کون سے انشائیے ہیں جو ہمیشہ مشہور رہیں گے؟

۱۳۔ پطرس کے انشائیے ''ہاسٹل میں پڑھنا'' کی خصوصیات لکھیے۔انشائیے کی خصوصیات کے حوالے سے۔

۱۴۔ پطرس نے اپنے مضامین اور انشائیوں سے اُردو انشائیہ نگاری کو ایک نئی سمت عطا کی۔ آپ اس خیال سے کس حد تک متفق ہیں؟

اکائی 29: سلیس بحوالہ سیاق وسباق

(Explanation with reference to Context)

نوٹ: نصاب میں شامل پانچ انشائیوں میں سے کم سے کم دو اقتباسات انشائیہ کے عنوان اور انشائیہ نگار کے نام کے حوالہ کے ساتھ سلیس اُردو میں لکھنا مطلوب ہوں گے۔ اقتباس کا انتخاب کرنے کا امیدوار کو سو فیصدی حق ہوگا۔ (یہاں نمونے کے طور پر صرف دو اقتباسات کی بحوالہ مضمون اور مصنف تشریح یا وضاحت کی جاتی ہے۔)

(ا) یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا.........اور ان کو بے کار نہ چھوڑے۔

حوالہ اور سلیس:

یہ اقتباس سر سیّد احمد خان کے انشائیہ ''کاہلی'' سے لیا گیا ہے۔ اس انشائیے میں سر سیّد اپنے وطن کے لوگوں کو کاہلی چھوڑنے پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ کاہلی ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ کاہلی کا مطلب ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج یا مزدوری نہ کرنا یا چلنے پھرنے میں سُستی کرنا نہیں ہے۔ بل کہ اپنی اندرونی یعنی دِلی قوتوں کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ بے کار نہ بیٹھے بل کہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔

اس اقتباس میں سر سیّد احمد خان کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور اس میدان میں کافی ترقی بھی کرتے ہیں اور ہزاروں پڑھے لکھے لوگوں میں سے شاید کسی ایک کو یہ موقع ملتا ہوگا کہ وہ اپنی تعلیم اور عقل کو کام میں لائے۔ اگر انسان ان عارضی اور وقتی ضرورتوں کا انتظار کرے اور اپنے دل کی طاقتوں کو بے کار چھوڑ دے تو وہ بالکل کاہل ، سُست اور جنگلی بن جاتا ہے۔ انسان چوں کہ دوسرے حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے اور جب اس کے دل کی طاقتوں کی حرکت میں کمزوری اور سُستی پیدا ہو جاتی ہے اور جب یہ طاقتیں کام میں نہیں لائی جاتیں تو اُس کی عادتیں جانوروں جیسی ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہر ایک انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی اندرونی یعنی دل کی طاقتوں کو ہمیشہ

زندہ رکھنے کی کوشش کرے اور انھیں کسی حال میں بھی بے کار نہ چھوڑے۔

(۲) اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے راجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحبِ جمال............ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

حوالہ اور سلیس:

یہ اقتباس محمد حسین آزاد کے ایک تمثیلی انشائیہ ''شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار'' سے لیا گیا ہے۔ اس میں آزاد نے ایسی عالمی شہرت والی شخصیات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دِیے ہیں جن کی وجہ سے ان کو رہتی دنیا تک یاد کیا جاتا رہے گا۔

یہ انشائیہ اُن کے مضامین کے مجموعہ ''نیرنگِ خیال'' میں موجود ہے۔ یہ انشائیہ آزاد نے تمثیلی انداز میں تحریر کیا ہے۔ وہ اس انشائیے میں کہتے ہیں کہ بقائے دوام یعنی ہمیشگی یا پائیداری دو طرح کی ہے۔ ایک روح کی طرح ہے جو مرنے کے بعد بھی رہ جاتی ہے اور اسے فنا نہیں ہے۔ دوسری وہ بقا ہے جو دُنیا میں یادگار کے طور پر رہ جاتی ہے اور جس کی بدولت لوگ ہمیشگی کی شہرت پاتے ہیں اور ہمیشہ یاد کیے جاتے ہیں۔

آزاد کا یہ انشائیہ عالمِ خواب کی تخلیق ہے۔ اس میں وہ لوگوں کو گروہوں کی صورت میں ایک پہاڑی کے اوپر بنے ایک محل میں جمع ہوتے ہوئے بتاتے ہیں جہاں عالمی شہرت رکھنے والی یہ شخصیات اپنے اپنے مقام و مرتبے کے مطابق داخل ہو کر بیٹھتے ہیں۔

اس اقتباس میں آزاد کئی نامور شخصیات کے بعد ایک اور بادشاہ کے آنے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی شکل وصورت سے راجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود شراب کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا مگر ایک خوب صورت عورت اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے جدھر چاہتی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا یا کرتا اُسی خوب صورت عورت کی خوب صورتی کی نظر سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان یعنی اُس کی مرضی کے مطابق کہتا تھا۔ انھیں اس رنگ میں دیکھ کر سب لوگ مسکرائے مگر اُس کے ساتھ دولت اور خوش نصیبی تھی اور یہ کہ قسمت اُس کے انتظام میں آ گئے آ گئی تھی۔ اس لیے وہ زیادہ نشے میں ڈوبا رہتا تھا۔ وہ بادشاہ جہانگیر تھا اور عورت اُس کی بیگم نور جہاں تھی۔

اکائی 30:   غیر درسی اقتباسات

(Unseen passage)

نوٹ: اس حصے میں ایک غیر درسی اقتباس دیا جائے گا اور اقتباس کے آخر میں دو سوالات پوچھے جائیں گے۔ اُمید واروں کو دونوں سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔ ہر سوال کے نمبر مساوی ہوں گے۔

(یہاں نمونے کے طور پر چند غیر درسی اقتباسات مع سوال و جواب دیے جا رہے ہیں۔)

1

بوڑھا گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھلے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکا یک اس کو آسمان کے بیچ ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی اس نے ٹکٹکی باندھ کر اس کو دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ اس کے قریب آتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آ گئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا، اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجہ سے اسے پوچھا کہ تم کون ہو؟''۔ وہ بولی! کہ ''میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔'' اس نے پوچھا کہ ''تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے ''۔ وہ بولی: ہاں ہے، نہایت آسان، پر بہت مشکل،۔ جو کوئی خدا کے فرض ادا کر کر انسان کی بھلائی اور اس کی میں بہتری میں سعی کرے اس کے میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے جو آخر تک رہے گا۔ جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے۔ وہی نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوۃ، اسی تک ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسانوں کی بھلائی میں کوشش کرے۔''۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بوڑھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

س۔ بوڑھا گھبرا کر کیا کرتا ہے اور اسے کیا دکھائی دیتا ہے۔

ج ۔ بوڑھا گھبرا کر کھڑکی کی طرف دوڑتا ہے۔اس کے پٹ کھول کر دیکھتا ہے کہ آسمان صاف ہے۔آندھی تھم گئی ہے۔گھٹا کھل گئی ہے۔تارے نکل آئے ہیں۔ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہوگیا ہے۔وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکا یک اس کو آسمان کے بیچ ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔

س۔ دلہن بوڑھے سے کیا کہتی ہے۔

ج۔ دلہن بوڑھے سے کہتی ہے کہ ''میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں'' جو کوئی خدا کے فرض ادا کر کر انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کے میں مسخر ہوتی ہوں۔دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔انسان ہی ایسی چیز ہے جو آخر تک رہے گا۔میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسانوں کی بھلائی میں کوشش کرے.

۲

شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے،اس لئے اس کی جامع و مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھنا زیادہ مفید ہوگا کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہوجائے۔خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں ۔ان میں سے دو قوتیں تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ ہیں۔ادراک اور احساس۔ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ہر قسم کی ایجادات،تحقیقات،انکشافات اور تمام علم وفنون اسی کے نتائج عمل ہیں۔ احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا، یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے۔اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہوجاتا ہے۔غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے۔خوشی میں سرور ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔یہی قوت جس کو احساس،انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں،شاعری کا دوسرا نام ہے۔یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازیں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔مثلاً شیر گونجتا ہے،مور چنگاڑتے ہیں،کوئل کوکتی ہے،

طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتا ہے، انسان کے جذبات بھی حرکت کے ذریعے سے ادا ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی۔ اس لئے جب اس پر قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں، اسی کا نام شعر ہے۔

س۔ ادراک واحساس میں کیا فرق ہے۔

ج۔ ادراک کا کام اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے۔ ہر قسم کی ایجادات، تحقیقات، انکشافات اور تمام علم وفنون اسی کے نتائج عمل ہیں۔ احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا، یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے۔ خوشی میں سرور ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے

س۔ انسان اور حیوانات اپنے جذبات کا اظہار کیسے کرتے ہیں ہے۔

ج۔ حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازیں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر گونجتا ہے، مور چنگاڑتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتا ہے، انسان کے جذبات بھی حرکت کے ذریعے سے ادا ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی۔ اس لئے جب اس پر قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں

۳

صاحبو! ہم جاپان کو ذرا دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے لیکن ہماری یہ خواہش محض اس لیے پوری نہیں ہوئی کہ یونیسکو کی چھتری ہمارے ساتھ تھی۔ محض اس چھتری کے خاطر ہمیں ایک مقام کو دو دو مرتبہ دیکھنا پڑتا تھا۔ اور دوسری مرتبہ اس مقام سے اپنی بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے جاتے تھے۔ جاپان ریڈیو بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا انٹرویو ریکارڈ کرانے اور دوسری مرتبہ یونیسکو کی چھتری کو واپس لانے کے لیے۔ جاپان کی زنانہ یونیورسٹی میں بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا خیر مقدم کروانے کے لیے اور دوسری مرتبہ اپنی چھتری کو واپس لانے کے لیے۔ اگرچہ تھائی لینڈ کی مندوب مس پرینیا کا خیال تھا کہ ہم جان بوجھ کر زنانہ یونیورسٹی میں اپنی چھتری بھول آئے تھے تاکہ وہاں

ایک اور بار جانے کا بہانہ ہاتھ آ سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری بھول بھی بڑی سوچی سمجھی ہوتی ہے۔ خیر دنیا کی زبان کو کون روک سکتا ہے اور دنیا نے کب کس کا بھلا چاہا ہے۔ تاہم اتنا جانتے ہیں کہ زنانہ یونیورسٹی سے اپنی بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے کے لیے ہم جس قدر خوشی خوشی گئے تھے کہیں اور نہیں گئے بلکہ دوسری مرتبہ بھی اس چھتری کو وہیں چھوڑے آ رہے تھے۔ بڑا ہو یونیورسٹی کے عہدہ دار کا کہ ہمارے دبے پاؤں واپس جاتے وقت پکار کر کہا ''مسٹر حسین آپ جس چھتری کو لینے آئے ہیں، اسے پھر بولے جا رہے ہیں''۔ ہم نے بادل نخواستہ عہدیدار کا شکریہ ادا کیا اور راستہ بھر ان کے تیز حافظے کو کوستے آئے۔ اس چھتری کو ہم کہاں کہاں بھولے اس کا حساب بتانا دشوار ہے۔ ہم اسے لے کر یوکوہاما گئے، اومیا گئے، نارا گئے، کیوٹو گئے اور ہر جگہ اسے بھولے مگر یہ پھر بھی ہمیں واپس مل ہی گئی۔ کیوٹو کے ہالی ڈے ان میں ہی رہ گئی ہے۔ بھاگم بھاگ واپس گئے تو دیکھا کہ کمرے پر ایک نوجوان جوڑے نے قبضہ کر لیا ہے۔

س۔ **مصنف جاپان کو اطمینان سے کیوں نہیں دیکھ سکا۔**

ج۔ ہم جاپان کو ذرا دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے لیکن ہماری یہ خواہش محض اس لیے پوری نہیں ہوئی کہ یونیسکو کی چھتری ہمارے ساتھ تھی۔ محض اس چھتری کے خاطر ہمیں ایک مقام کو دو دو مرتبہ دیکھنا پڑتا تھا۔ اور دوسری مرتبہ اس مقام سے اپنی بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے جاتے تھے۔ جاپان ریڈیو بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا انٹرویو ریکارڈ کرانے اور دوسری مرتبہ یونیسکو کی چھتری کو واپس لانے کے لیے۔ جاپان کی زنانہ یونیورسٹی میں بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا خیر مقدم کروانے کے لیے اور دوسری مرتبہ اپنی چھتری کو واپس لانے کے لیے۔

س۔ **مصنف چھتری کو کہاں کہاں بھولے۔**

ج۔ اس چھتری کو ہم کہاں کہاں بھولے اس کا حساب بتانا دشوار ہے۔ ہم اسے لے کر یوکوہاما گئے، اومیا گئے، نارا گئے، کیوٹو گئے اور ہر جگہ اسے بھولے مگر یہ پھر بھی ہمیں واپس مل ہی گئی۔ کیوٹو کے ہالی ڈے ان میں ہی رہ گئی ہے۔

۴

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کے مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا۔ اخیر میں ان کی خوراک بہت کم ہو چکی تھی۔ صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے۔ دن کو جو کھانا ان کے لئے گھر سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا

۔ایک پیالے میں بوٹیاں، دوسرے میں لعاب وشوربہ،ایک پیالی میں ایک چھلکے کا چھاکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔ایک پیالی میں کبھی کبھی انڈے کی زردی، اور ایک اور پیالی میں دو تین پیسہ دہی، اور شام کو کسی قدر شامی کباب، بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دسترخوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا نہایت تھا مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا"اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے، اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا"۔

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا، ان کے مکان کے آگے اندھے، لولے، لنگڑے اور آپاہج مرد وعورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہوگئی تھی۔اور کھانے، پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسب معمول سات پارچہ کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔لفٹنٹ کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔مرزا صاحب کو پہلے معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔اس لئے انھوں دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھی۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بیٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تو تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔

س۔ **اخیر دنوں میں مرزا کی خوراک کی کیا خوراک تھی۔**

ج۔ اخیر میں ان کی خوراک بہت کم ہو چکی تھی۔صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے۔دن کو جو کھانا ان کے لئے گھر سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ایک پیالے میں بوٹیاں، دوسرے میں لعاب وشوربہ،ایک پیالی میں ایک چھلکے کا چھاکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔ایک پیالی میں کبھی کبھی انڈے کی زردی، اور ایک اور پیالی میں دو تین پیسہ دہی، اور شام کو کسی قدر شامی کباب، بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔

س۔ **مرزا کی آمدنی اور خرچ کے بارے میں بتائیں۔**

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا، ان کے مکان کے آگے اندھے، لولے، لنگڑے اور آپاہج مرد وعورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر

ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ہوگئی تھی۔ اور کھانے، پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔

۵

غزل اردو شاعری کی ہر دلعزیز صنف ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے متعلق یا عورتوں کی باتیں کرنا۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ ہرن کے منھ سے بوقتِ خوف جو درد بھری آواز نکلتی ہے اسے بھی غزل کہا جاتا ہے۔ لیکن اصطلاحی معنوں میں غزل کی مختلف تعریفیں اور تعبیریں پیش کی گئی ہیں، جن کا مفہوم یہ ہے کہ غزل شاعری کی وہ صنف جس کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے۔ آل احمد سرور نے غزل کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی
ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی

اردو شاعری میں غزل کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ مثلاً قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، وغیرہ۔ مگر جو مقبولیت اور شہرت غزل کو حاصل ہے وہ کسی دوسری صنف کو نصیب نہ ہو سکی۔ طرفہ تماشہ یہ کہ اردو میں جب سے تنقید کا آغاز ہوا، اسی وقت سے غزل کی مخالفت بھی شروع ہوگئی۔ حالؔی کو اس میں سنڈاس کی بو محسوس ہوئی۔ کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن کہا۔ عظمت اللہ خان نے غزل کی گردن کو بے تکلف اڑا دینے کا مشورہ تک دے دیا۔ لیکن ایسی شدید مخالفت کے باوجود غزل کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس کی بڑھتی ہوئی عظمت و مقبولیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ''رشید احمد صدیقی'' جیسے جید، عالم، نقاد اور شاعر نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا۔ غزل جن اجزاء سے بنتی یا سنورتی ہے ان میں مطلع، مقطع، بحر، ردیف، قافیہ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اردو شاعری کی دیگر اصناف کی طرح غزل بھی فارسی کے اثرات سے اردو میں آئی، اردو میں سب سے پہلے غزل کس نے لکھی یا پھر پہلا غزل گو کسے مانا جائے اس سلسلے میں ناقدین کے ہاں تضاد ملتا ہے، کیوں کہ کچھ عرصہ پہلے تک ولؔی دکنی کو ہی اردو غزل کا ''باوا آدم'' کہا جا رہا تھا، لیکن جدید تحقیق کے مطابق غزل کے اوّلین نقوش ہمیں خسرؔو کے کلام میں ملتے ہیں۔ بہر حال اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کو مانا گیا ہے، جن کا تعلق دکن سے ہے اور شمالی ہند کا پہلا شاعر ''فائز دہلوی'' کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر، غزل اپنے تاریخی ارتقاء کی جن منازل سے گزرتی رہی، ان میں کہیں ولؔی اور سراج اورنگ آبادی نے محبوب

کے سراپے کو پیش کیا تو کہیں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ نے سوز و گداز اور صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا، جہاں ایک طرف شاہ حاتم اور مظہر جانِ جاناں نے غزل کو بناوٹی رنگ سے آزاد کرایا تو وہیں دوسری طرف مصحفیؔ، انشاؔ، اور جرأتؔ نے زبان کی اصلاح پر دھیان دیا۔

س۔ غزل سے متعلق چند نظریات پیش کریں۔

ج۔ حالیؔ کو غزل میں سنڈاس کی بو محسوس ہوئی۔ کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن کہا۔ عظمت اللہ خان نے غزل کی گردن کو بے تکلف اڑا دینے کا مشورہ تک دے دیا۔ لیکن ایسی شدید مخالفت کے باوجود غزل کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس کی بڑھتی ہوئی عظمت و مقبولیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ''رشید احمد صدیقی'' جیسے جید، عالم، نقاد اور شاعر نے غزل کو اُردو شاعری کی آبرو کہا۔

س۔ غزل میں اولیت کسے حاصل ہے۔

ج۔ اردو میں سب سے پہلے غزل کس نے لکھی یا پھر پہلا غزل گو کسے مانا جائے اس سلسلے میں ناقدین کے ہاں تضاد ملتا ہے، کیوں کہ کچھ عرصہ پہلے تک ولیؔ دکنی کو ہی اردو غزل کا ''باوا آدم'' کہا جا رہا تھا، لیکن جدید تحقیق کے مطابق غزل کے اوّلین نقوش ہمیں خسروؔ کے کلام میں ملتے ہیں۔ بہر حال اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کو مانا گیا ہے، جن کا تعلق دکن سے ہے اور شمالی ہند کا پہلا شاعر ''فائز دہلوی'' کو تسلیم کیا گیا ہے۔

۶

مومن خان مومنؔ کا شمار غالبؔ کے بعد عہدِ زرّیں کے دوسرے بڑے شاعر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام محمد مومن خان اور مومنؔ تخلص تھا۔ دہلی میں ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ حکیم غلام نبی خان کے بیٹے تھے۔ خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ مومن کا نام ان کے والد کے مرشد شاہ عبدالعزیز نے تجویز کیا تھا۔ مومن نے شاہ عبدالقادر سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ طب اپنے والد سے پڑھی۔ اس کے علاوہ ریاضی، نجوم، موسیقی اور شطرنج میں بھی مومن بڑی مہارت رکھتے تھے۔ خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے شاعری کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ کسی دربار سے بھی وابستہ نہیں ہوئے۔ شاہ نصیرؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں قائم نہیں رہا۔ آخر کار مذاقِ سخن نے ہی رہبری کی اور مومنؔ ایک بہترین شاعر کی حیثیت سے ابھر کر اُردو دنیا میں مشہور ہو گئے۔ مومن خان مومنؔ کا اصل میدان غزل

ہے۔اوران کی غزل کا دائرہ حسن وعشق تک محدود ہے۔لیکن اس محدود دائرے میں انھوں نے ایسے کمال کا مظاہرہ کیا ہے کہ آج اتنا زمانہ بدل جانے کے بعد بھی اہل نظران کی غزل پر فریفتہ ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے معاملاتِ عشق کی جزئیات کوایسی خوب صورتی اورفن کاری سے پیش کیا ہے کہ نہ کہیں پستی کا احساس ہوتا ہے اور نہ یکسانیت کا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ واقعتاً مومن نے زندگی میں عشق کیا تھا۔اور ایک پردہ نشین خاتون کو چاہا تھا۔ یہ شاعرہ تھی اور حجاب تخلص کرتی تھی۔مومن کے کلام میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں اصلیت کا رنگ پیدا ہوگیا ہے اور جذبات کی شدت بھی صاف ظاہر ہوتی ہے۔مختصر یہ کہ انھوں نے عاشقانہ مضامین ایسے دلکش انداز میں پیش کیے ہیں کہ قدم قدم پر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔اس لئے تغزل کی نرالی شان پیدا ہوگئی ہے۔

س۔ **مومن کو کن کن چیزوں میں مہارت حاصل تھی۔**

ج۔ علم طب اپنے کے علاوہ مومن ریاضی، نجوم، موسیقی اور شطرنج میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔

س۔ **مومن کی غزل کے امتیازی نقوش تلاش کریں۔**

ج۔ مومن کی غزل کا دائرہ حسن وعشق تک محدود ہے۔لیکن اس محدود دائرے میں انھوں نے ایسے کمال کا مظاہرہ کیا ہے کہ آج اتنا زمانہ بدل جانے کے بعد بھی اہل نظران کی غزل پر فریفتہ ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے معاملاتِ عشق کی جزئیات کوایسی خوب صورتی اورفن کاری سے پیش کیا ہے کہ نہ کہیں پستی کا احساس ہوتا ہے اور نہ یکسانیت کا، کہ انھوں نے عاشقانہ مضامین ایسے دلکش انداز میں پیش کیے ہیں کہ قدم قدم پر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔اس لئے تغزل کی نرالی شان پیدا ہوگئی ہے۔

۷

اُردو شاعرات میں پروین شاکر کواپنے اسلوب اورلہجہ کی ندرت کی بنا پر ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ان کے والدین تقسیم ہند کے دوران صوبہ بہار سے پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔وہ موضع چندن پٹی تحصیل لہریا سرائے ضلع دربھنگہ کے رہنے والے تھے۔ہجرت کا یہ عمل غیر شعوری طور پر ہوا تھا۔بہار کا کھاتا پیتا خاندان پاکستان میں مہاجر کہلایا۔اسی خاندان میں ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو پروین شاکر کی پیدائش کراچی میں ہوئی۔شاکر کے والد سید ثاقب حسین بھی اُردو زبان کے ایک بہترین شاعر تھے اور شاکر تخلص کرتے تھے۔اسی مناسبت سے پروین نے بھی شاکر کا تخلص اختیار کیا تھا۔اور پروین

شاکر کے نام سے شہرت بھی حاصل کی۔ ورنہ ان کا ابتدائی تخلص بینا تھا۔ پروین نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر میٹرک تک رضیہ گرلز ہائی اسکول پڑھا۔ بی۔اے کی ڈگری سرسید گرلز کالج سے حاصل کی۔ پھر کراچی یونی ورسٹی سے پہلے انگریزی میں اور پھر لسانیات میں ایم۔اے کیا۔ اسی طرح ہارورڈ یونی ورسٹی امریکہ سے بینک ایڈمنسٹریشن میں بھی ایم۔اے کیا۔ ۱۹۷۱ء میں انھوں نے ''جنگ میں ذرائع ابلاغ کا کردار'' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

پروین نے شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس لئے شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ہمیں آورد نہیں بل کہ آمد نظر آتی ہے۔ شاعروں میں سے پروین، احمد ندیم قاسمی سے بے حد متاثر تھیں۔ احمد ندیم قاسمی نے ان کے بارے میں کیا خوب کہا ہے کہ۔

''پروین شاکر کی آواز کے زیروبم میں روح کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اردو شاعری میں ہر لحاظ سے یہ نئی آواز ہے۔''

پروین شاکر کے چھ شعری مجموعے ہیں۔ جو ''خوشبو''، صد برگ''، خود کلامی''، انکار''، کفِ آئینہ'' کے نام سے شائع ہو کر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ تمام شعری مجموعے ان کی کلیات ''ماہ تمام'' میں شامل ہیں، جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔

س۔ **پروین شاکر کا ابتدائی تخلص کیا تھا اور ان کی تعلیمی قابلیت کیا تھی۔**

ج۔ ان کا ابتدائی تخلص بینا تھا۔ پروین نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر میٹرک تک رضیہ گرلز ہائی اسکول پڑھا۔ بی۔اے کی ڈگری سرسید گرلز کالج سے حاصل کی۔ پھر کراچی یونی ورسٹی سے پہلے انگریزی میں اور پھر لسانیات میں ایم۔اے کیا۔ اسی طرح ہارورڈ یونی ورسٹی امریکہ سے بینک ایڈمنسٹریشن میں بھی ایم۔اے کیا۔ ۱۹۷۱ء میں انھوں نے ''جنگ میں ذرائع ابلاغ کا کردار'' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

س۔ **پروین شاکر کے کتنے شعری مجموعے ہیں اور کن ناموں سے شائع ہوئے ہیں۔**

ج۔ پروین شاکر کے چھ شعری مجموعے ہیں۔ جو ''خوشبو''، صد برگ''، خود کلامی''، انکار''، کفِ آئینہ'' کے نام سے شائع ہو کر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ تمام شعری مجموعے ان کی کلیات ''ماہ تمام'' میں شامل ہیں، جو ۱۹۹۴ء میں شائع

ہو چکا ہے۔

۸

زندگی کی جدوجہد میں وہ لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں، جن کی صحت اچھی ہوتی ہے۔ بعض طلباء ہر وقت کتابی کیڑے بنے رہتے ہیں اور کھیل کود کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ ان کی صحت کمزور ہو جاتی ہے۔ اور بعض کی تو نظر بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچپن میں ہی انہیں عینک لگ جاتی ہے۔ یہ طلباء اگرچہ امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کر لیتے ہیں، مگر بڑے ہو کر ترقی نہیں کر سکتے۔ وہ محنت سے جی چرانے لگتے ہیں۔ کیونکہ صحت انہیں سخت محنت کی اجازت نہیں دیتی۔ اسکے برعکس جو طلباء اور طالبات اپنی سکول و کالج کی پڑھائی کے دوران کسرت کرتے ہیں، یا کھیل کود میں حصہ لیتے ہیں، وہ زندگی کی جدوجہد میں آسانی سے کود سکتے ہیں۔ اور آنے والے دنوں میں سخت محنت کر کے ترقی کر سکتے ہیں۔ کسرت کے مقابلہ میں کھیل کود زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے سارے جسم میں کسرت ہو جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی دوستوں کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے ایک حد تک دل بہلا وا بھی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کھیل کود کے بیشمار فائدے ہیں ان کے ذریعے ہم زندگی کی جدوجہد میں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ناکامیوں کو بھی برداشت کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ یہ ہمیں ڈسپلن میں رہنا سکھاتا ہیں۔ باہمی تعاون ملتا ہے۔ کھیل کود سے خون کی گردش تیز ہو کر ہر حصہ تک آکسیجن کو پہنچتی ہے۔ جس سے جسم سڈول، خوبصورت اور صحت مند ہو جاتا ہے۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی صحت اچھی ہو جاتی ہے اور وہ زندگی میں محنت مشقت کے قابل ہو جاتا ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک صحت مند دماغ کے لئے صحت مند جسم کا ہونا ہی ضروری ہے۔ اس لئے ہماری رائے میں سارے طلباء کو اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں بھی حصہ لینا چاہئے

س۔ **تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود کیوں ضروری ہے۔**

ج۔ طلباء ہر وقت کتابی کیڑے بنے رہتے ہیں اور کھیل کود کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ ان کی صحت کمزور ہو جاتی ہے۔ اور بعض کی تو نظر بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچپن میں ہی انہیں عینک لگ جاتی ہے۔ یہ طلباء اگرچہ امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کر بھی لیتے ہیں، مگر بڑے ہو کر ترقی نہیں کر سکتے۔ وہ محنت سے جی چرانے لگتے ہیں۔ کیونکہ صحت انہیں سخت محنت کی اجازت نہیں دیتی۔ اسکے برعکس جو طلباء اپنے سکول و کالج کی پڑھائی کے دوران

کسرت کرتے ہیں یا کھیل کود میں حصہ لیتے ہیں، وہ زندگی کی جدوجہد میں آسانی سے کود سکتے ہیں اس لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود کیوں ضروری ہے۔

س۔ کھیل کود کے کیا فائدے ہیں۔

ج۔ کھیل کود کے بیشمار فائدے ہیں ان کے ذریعے ہم زندگی کی جدوجہد میں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ناکامیوں کو بھی برداشت کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ یہ ہمیں ڈسپلن میں رہنا سکھاتا ہیں۔ باہمی تعاون ملتا ہے۔ کھیل کود سے خون کی گردش تیز ہوکر ہر حصہ تک آکسیجن کو پہنچتی ہے۔ جس سے جسم سڈول، خوبصورت اور صحت مند ہو جاتا ہے۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی صحت اچھی ہو جاتی ہے اور وہ زندگی میں محنت مشقت کے قابل ہو جاتا ہے۔

۹

اردو ادب کو زندگی کے قریب لانے اور زندگی کا ترجمان بنانے میں ترقی پسند تحریک نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کو منظر عام پر لانے میں برطانوی سامراج کی آمریت، ملک میں بے اطمینانی و ناآسودگی کے جذبات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر جبر و استبداد، غریبوں کا استحصال اور دبے کچلے لوگوں کی حالتِ زار جیسے حالات و واقعات بڑے اہم ہیں۔ انقلاب روس کے نتیجے میں ابھرنے والی عوامی تحریکوں اور ہٹلر کے فاشزم کے خلاف پائے جانے والے شدید ردِ عمل کی لہر نے جہاں دنیا بھر کے ذہنوں کو جھنجھوڑا، وہیں یورپ کی یونی ورسٹیوں میں اعلا تعلیم حاصل کرنے والے ہندوستانی طلبا کے ذہنوں کو بھی متاثر کیا۔ جن میں لندن میں مقیم سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ سجاد ظہیر نے ہندوستان میں ترقی پسند انجمن قائم کرنے کی کوشش کی اور لندن سے واپس آکر ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کو اس تحریک سے روشناس کرایا۔ 1936ء تک برقی رو کی طرح لکھنو، الہ آباد، دہلی، لاہور، بمبئی، حیدرآباد اور ملک کے ان تمام شہروں میں پھیل گئی جہاں لوگوں کو ادب سے کچھ لگاؤ تھا۔ پریم چند، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، ٹیگور وغیرہ نے اس تحریک کو اپنی نیک تمناؤں اور دعاؤں سے نوازا۔

س۔ ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے کے کیا اسباب تھے۔

ج۔ ترقی پسند تحریک کو منظر عام پر لانے میں برطانوی سامراج کی آمریت، ملک میں بے اطمینانی و ناآسودگی کے جذبات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر جبر و استبداد، غریبوں کا استحصال اور دبے کچلے لوگوں کی حالتِ زار جیسے حالات

دو واقعات بڑے اہم تھے۔

س۔ **ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں کے نام بتائیں۔**

ج۔ سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، پریم چند، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، ٹیگور وغیرہ اس تحریک سے وابستہ اہم لوگ ہیں۔

۱۰

اقبال کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ وہ ابتدائی زمانۂ تعلیم ہی سے طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس زمانہ میں داغ کی شاعری کا تمام ہندوستان میں چرچا تھا۔ اقبال نے بھی بذریعہ خط و کتابت ان سے اصلاح لینی شروع کی جس کا اثر اقبال کی زبان پر خاطر خواہ پڑا۔ صفائی و سلاست کا فیض غالباً داغ ہی کی اصلاح کا نتیجا ہے۔ اقبال کی جدّت پسند طبیعت کے لیے مشکل تھا کہ داغ کے محدود دائرے میں مقید رہتی، ان کی فکر کو بلندی و پرواز کی ضرورت تھی جس کا سامان بجز غالب کسی کے یہاں دشوار تھا۔ چناں چہ موصوف نے غالب کی پروازِ فکر کی پیروی کی۔

سوالات:

س۔ **اقبال کی زبان پر کس کا اثر پڑا؟**

ج۔ اقبال کی زبان پر داغ کی اصلاح کا اثر خاطر خواہ پڑا۔

س۔ **اقبال کی جدّت پسند طبیعت کے لیے کیا بات مشکل تھی؟**

ج۔ اقبال کی جدت پسند طبیعت کے لیے مشکل تھا کہ وہ داغ کے محدود دائرے میں مقید رہتی۔

☆☆☆

اکائی 31: معروضی سوالات

(حصہ ب)

objective type questions

نوٹ: نصاب میں شامل اس حصہ سے آٹھ سوالات پوچھے جائیں گے۔ ہر سوال کے تین ممکنہ جوابات ہوں گے۔ امیدوار کو ہر سوال کا صرف ایک ہی درست اور صحیح جواب دینا ہوگا۔ ذیل میں نمونے کے طور پر چند سوالات مع جوابات دیئے جارہے ہیں۔

سوالات

۱۔ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کس ہجری میں شائع ہوئی۔؟

جواب: ۱۔ ۱۱۹۹ھ ۲۔ ۱۱۲۱ھ ۳۔ ۱۱۸۵ھ

۲۔ مثنوی سحر البیان کس بادشاہ کے عہد میں لکھی گئی۔؟

جواب: ۱۔ آصف الدولہ ۲۔ نواب الدولہ ۳۔ شجاع الدولہ

۳۔ میر حسن کی آخری طبع زاد مثنوی کون سی ہے۔؟

جواب: ۱۔ سحر البیان ۲۔ مثنوی گلزار ارم ۳۔ مثنوی درخوان نعمت

۴۔ مثنوی سحر البیان کو کس نے مرتب کیا۔؟

جواب: ۱۔ رشید حسن خان ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ سرسید

۵۔ میر حسن کا پورا نام کیا ہے۔؟

جواب: ۱۔ میر غلام حسن ۲۔ میر محمد حسن ۳۔ میر حسن

۶۔ میر حسن کب اور کہاں پیدا ہوئے۔؟

جواب: ۱۔ ۱۷۳۷ء دہلی ۲۔ ۱۷۴۰ء دہلی ۳۔ ۱۷۳۵ء دہلی

۷۔ میر حسن نے کب اور کہاں انتقال کیا۔؟

جواب: ا۔ ۱۷۸۶ء لکھنو ۲۔ ۱۷۹۰ء دہلی ۳۔ ۱۷۸۸ء دہلی

۸۔ دیا شنکر نسیم کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی۔؟

جواب: ا۔ ۱۸۱۱ء لکھنؤ ۲۔ ۱۸۱۵ء لکھنؤ ۳۔ ۱۸۰۸ء لکھنؤ

۹۔ دیا شنکر نسیم کا تعلق کس دبستان سے تھا۔؟

جواب: ا۔ لکھنؤ ۲۔ دہلی ۳۔ رام پور

۱۰۔ زین الملوک اور تاج الملوک سے ملاقات کے وقت بکاولی کس نام سے وزیر بنتی ہے۔؟

جواب: ا۔ فرخ ۲۔ نجم النساء ۳۔ انجم آرا

۱۱۔ مثنوی گلزار نسیم کو شاعرانہ اور فنکارانہ تخلیق کا معجزہ کس نے کہا ہے۔؟

جواب: ا۔ سید احتشام حسین ۲۔ رشید حسن خان ۳۔ محمد حسین آزاد

۱۲۔ میر سے متعلق ''شعر شور انگیز'' کس نے لکھی۔؟

جواب: ا۔ شمس الرحمٰن فاروقی ۲۔ کلیم الدین احمد ۳۔ خواجہ احمد فاروقی

۱۳۔ میرؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔؟

جواب: ا۔ ۱۷۲۲ء آگرہ ۲۔ ۱۷۲۵ء دہلی ۳۔ ۱۷۰۰ء لکھنو

۱۴۔ میرؔ کا انتقال کب اور کہاں ہوا۔؟

جواب: ا۔ ۱۸۱۰ء لکھنؤ ۲۔ ۱۸۱۵ء دہلی ۳۔ ۱۸۰۸ء بنارس

۱۵۔ میرؔ کس کے عہد میں لکھنؤ پہنچے۔؟

جواب: ا۔ آصف الدولہ ۲۔ نواب الدولہ ۳۔ شجاع الدولہ

۱۶۔ ''دریائے عشق، شعلۂ عشق اور خواب وخیال'' کس کی مثنویاں ہیں۔؟

جواب: ۱۔ میر تقی میرؔ ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ میر حسن

۱۷۔ میرؔ کی خود نوشت سوانح عمری کا نام کیا ہے۔؟

جواب: ۱۔ ذکرِ میرؔ ۲۔ نکات الشعرا ۳۔ فیضِ میر

۱۸۔ سرسید احمد خان کب اور کہاں پیدا ہوئے۔؟

جواب: ۱۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء دہلی ۲۔ ۱۲ اکتوبر ۱۸۱۷ء دہلی ۳۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۱۷ء دہلی

۱۹۔ سرسید کا انتقال کب اور کہاں ہوا۔؟

جواب: ۱۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء علی گڑھ ۲۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۰ء دہلی ۳۔ ۱۸۱۵ء علی گڑھ

۲۰۔ جدید اردو نثر کا بانی کس کو قرار دیا جاتا ہے۔؟

جواب: سرسید احمد خان ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ کنہیالال کپور

۲۱۔ سرسید کا کون سا انشائیہ نصاب میں شامل ہے۔؟

جواب: ۱۔ کاہلی ۲۔ عمر رفتہ ۳۔ خوش آمد

۲۲۔ سرسید کو انشا پردازی کا مجدد اور امام کس نے مانا ہے۔؟

جواب: ۱۔ شبلی ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ سرسید

۲۳۔ محمد حسین آزاد کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی۔؟

جواب: ۱۔ ۱۸۳۰ء دہلی ۲۔ ۱۸۴۰ء دہلی ۳۔ ۱۸۴۸ء دہلی

۲۴۔ محمد حسین آزاد کی وفات کب اور کہاں ہوئی۔

جواب: ۱۔ ۱۹۱۰ء لاہور ۲۔ ۱۹۱۵ء پنجاب ۳۔ ۱۹۱۱ء دہلی

۲۵۔ حکومت ہند نے محمد حسین آزاد کو شمس العلما کا خطاب کب عطا کیا۔؟

جواب: ا۔ ۱۸۸۷ء ۲۔۱۸۸۸ء ۳۔ ۱۸۹۰ء

۲۶۔ ''دربارِ اکبری اور سخن دان فارس'' کس کی تصانیف ہیں۔؟

جواب: ا۔ محمد حسین آزاد ۲۔ سرسید ۳۔ کنہیالال کپور

۲۷۔ ''آبِ حیات'' میں آزاد نے شاعروں کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا ہے۔؟

جواب: ا۔ پانچ ۲۔ سات ۳۔ دس

۲۸۔ ''آزاد گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے'' یہ کس کا قول ہے۔؟

جواب: ا۔ شبلی ۲۔حالی ۳۔ قمر رئیس

۲۹۔ ''نیرنگ خیال'' کس کے مضامین کا مجموعہ ہے۔؟

جواب: ا۔ محمد حسین آزاد ۲۔ سرسید ۳۔ کنہیالال کپور

۳۰۔ کنہیالال کپور کب اور کہاں پیدا ہوئے۔؟

جواب: ا۔ ۱۹۱۰ء لائل پور ۲۔ ۱۹۱۲ء لائل پور ۳۔ ۱۹۱۵ء لائل پور

۳۱۔ کنہیالال کپور کا انتقال کس سن میں ہوا۔؟

جواب: ا۔ ۱۹۸۰ء ۲۔ ۱۹۸۵ء ۳۔ ۱۹۹۰ء

۳۲۔ ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' کے عنوان سے کون کالم لکھا کرتے تھے۔؟

جواب: ا۔ کنہیالال کپور ۲۔ پطرس بخاری ۳۔ سرسید

۳۳۔ ''نوک و نشتر، سنگ و خشت اور نرم گرم'' کس کی تصانیف ہیں۔؟

جواب: ا۔ کنہیالال کپور ۲۔ سرسید ۳۔ آزاد

۳۴۔ ''کامریڈ شیخ چلی'' کا مصنف کون ہے۔؟

جواب: ا۔ کنہیالال کپور ۲۔ پطرس بخاری ۳۔ سرسید

۳۵۔ ''مضامین رشید'' کب شائع ہوا۔؟

جواب: ا۔ ۱۹۴۲ء ۲۔ ۱۹۴۴ء ۳۔ ۱۹۴۸ء

۳۶۔ ''مضامین رشید'' میں کل کتنے مضامین شامل ہیں۔؟

جواب: ا۔ ۲۰ ۲۔ ۲۲ ۳۔ ۲۵

۳۷۔ رشید احمد صدیقی کب اور کہاں پیدا ہوئے۔؟

جواب: ا۔ ۱۸۹۴ء جون پور ۲۔ ۱۸۹۶ء جون پور ۳۔ ۱۸۹۵ء جون پور

۳۸۔ رشید احمد صدیقی کا انتقال کب اور کہاں ہوا۔؟

جواب: ا۔ ۱۹۷۷ء علی گڑھ ۲۔ ۱۹۷۵ء علی گڑھ ۳۔ ۱۹۷۹ء علی گڑھ

۳۹۔ رشید احمد صدیقی کو 'پدم شری' ایواڈ کب ملا۔؟

جواب: ا۔ ۱۹۶۳ء ۲۔ ۱۹۶۵ء ۳۔ ۱۹۶۷ء

۴۰۔ رشید احمد صدیقی کی ریڈیائی تقریروں کے مجموعے کا نام بتائیں

جواب: ا۔ خنداں ۲۔ آمد میں آورد ۳۔ مثلث

۴۱۔ ''چارپائی، پاسبان اور ارہر کا کھیت'' کس کے انشائیے ہیں۔؟

جواب: ا۔ رشید احمد صدیقی ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ کنہیالال کپور

۴۲۔ ''گواہ'' کس کا مضمون ہے۔؟

جواب: ا۔ رشید احمد صدیقی ۲۔ پطرس بخاری ۳۔ سرسید

۴۳۔ پطرس بخاری کب اور کہاں پیدا ہوئے۔؟

جواب: ا۔ ۱۸۹۸ء پیشاور ۲۔ ۱۸۹۴ء پیشاور ۳۔ ۱۸۹۶ء پیشاور

۴۴۔ پطرس بخاری کی وفات کب اور کہاں ہوئی۔؟

جواب: ا۔ ۱۹۵۸ء نیویارک ۲۔ ۱۹۵۵ء نیویارک ۳۔ ۱۹۶۰ء نیویارک

۴۵۔ ''مضامین پطرس'' میں کل کتنے مضامین شامل ہیں۔؟

جواب: ا۔ گیارہ ۲۔ تیرہ ۳۔ نو

۴۶۔ ''اردو کی آخری کتاب'' کس کا مضمون ہے۔؟

جواب: ا۔ پطرس بخاری ۲۔ رشید احمد صدیقی ۳۔ کنہیالال کپور

۴۷۔ میر تقی میرؔ کی شاعری کو'' آہ'' اور کس کی شاعری کو''واہ'' کہا گیا ہے؟

جواب: ا۔ محمد رفیع سوداؔ ۲۔ پطرس بخاری ۳۔ رشید احمد صدیقی

۴۸۔ ۱۸۶۶ء میں کس نے انجمن برٹش ایسوسیایشن کے نام سے تنظیم بنائی تھی؟

جواب: ا۔ سر سید احمد خان ۲۔ رشید احمد صدیقی ۳۔ کنہیالال کپور

۴۹۔ دیا شنکر نسیم کس کے شاگرد تھے؟

جواب: ا۔ آتش ۲۔ محمد رفیع سوداؔ ۳۔ میرؔ

۵۰۔ ''اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے'' کس کا ماننا ہے؟

جواب: ا۔ محمد حسین آزاد ۲۔ میر امن ۳۔ محمود شیرانی

۵۱۔ اُردو کا پہلا واسوخت نگار کسے تسلیم کیا گیا ہے؟

جواب: ا۔ میرؔ ۲۔ سوداؔ ۳۔ آتش

۵۲۔ آزادؔ نے اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں اُردو غزل کا باوآدم کسے کہا ہے؟

جواب: ۱۔ ولیؔ ۲۔ میرؔ ۳۔ سوداؔ

۵۳۔ وہ مسلسل نظم جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوں، کیا کہلاتی ہے؟

جواب: ۱۔ مثنوی ۲۔ غزل ۳۔ رباعی

۵۴۔ شاعری کی کون سی صنف داستان کے قریب ہے؟

جواب: ۱۔ مثنوی ۲۔ قصیدہ ۳۔ نظم

۵۵۔ مثنوی کا شہنشاہ کون کہلاتا ہے؟

جواب: ۱۔ میر حسنؔ ۲۔ میرؔ ۳۔ سوداؔ

۵۶۔ کس صنف کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں؟

جواب: ۱۔ مثنوی ۲۔ غزل ۳۔ رباعی

۵۷۔ اُردو ادب کا ''اسٹیفن لیکاک'' کسے کہا گیا ہے؟

جواب: ۱۔ پطرس ۲۔ سر سید احمد خان ۳۔ رشید احمد صدیقی

۵۸۔ محمد حسین آزاد کس کے شاگرد رہے ہیں؟

جواب: ۱۔ ذوقؔ ۲۔ میرؔ ۳۔ حالیؔ

۵۹۔ مرتبہ اُردو شاعری میں میرؔ کو حاصل ہے وہی اُردو نثر میں میر امنؔ کو حاصل ہے۔ کس نے کہا ہے؟

جواب: ۱۔ سر سید احمد خان ۲۔ سوداؔ ۳۔ آتشؔ

۶۰۔ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کب جاری ہوا؟

جواب: ا۔ ۱۸۷۰ء ۲۔ ۱۸۷۵ء ۳۔ ۱۸۸۰ء

۶۱۔ اردو میں مضمون نویسی کی باقاعدہ ابتداء کس کے ہاتھوں ہوئی ؟

جواب: ا۔ سرسید احمد خان ۲۔ رشید احمد صدیقی ۳۔ محمد حسین آزاد

۶۲۔ غزل کو اردو شاعری کی آبرو کس نے قرار دیا تھا؟

جواب: ا۔ رشید احمد صدیقی ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ میر امن

۶۳۔ سرسید نے ولیم میور کی تصنیف 'لائف آف محمد' کا منہ توڑ جواب کون سی کتاب لکھ کر دیا؟

جواب: ا۔ خطباتِ احمدیہ ۲۔ آثار الصنادید ۳۔ جام جم

۶۴۔ درج ذیل شخصیات میں سے اُردو کا ٹامس گرے کسے کہا جاتا ہے۔

جواب: ا۔ پطرس ۲۔ سوداؔ ۳۔ آتش

۶۵۔ مشہور مثنوی ''سحر البیان'' کس نے لکھی ہے؟

جواب: ا۔ میر حسن ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ میر امن

۶۶۔ سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد سرسید نے کس شہر میں ڈالی۔؟

جواب: ا۔ غازی پور ۲۔ دہلی ۳۔ بنارس

۶۷۔ آثار الصنادید میں کس شہر کی عمارتوں کا ذکر ہے؟

جواب: ا۔ دہلی ۲۔ جموں ۳۔ غازی پور

۶۸۔ میر حسنؔ کی مثنوی ''سحر البیان'' کا دوسرا نام کیا ہے؟

جواب: ا۔ قصہ بے نظیر و بدرِ منیر ۲۔ قصہ بکاولی ۳۔ قصہ درد و غم

۶۹۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کب لکھی؟

جواب: ا۔ ۱۸۸۰ء ۲۔ ۱۸۸۵ء ۳۔ ۱۸۵۷ء

۷۰۔ پطرس بخاری کا کون سا مضمون شاملِ نصاب ہے؟

جواب: ا۔ ہاسٹل میں پڑھنا ۲۔ کتے ۳۔ مرحوم کی یاد میں

۷۱۔ نسیم نے ''گلزارِ نسیم'' کب لکھی؟

جواب: ا۔ ۱۸۳۸ء ۲۔ ۱۸۸۰ء ۳۔ ۱۸۳۰ء

۷۲۔ ''غالبؔ جدید شعراء کی مجلس میں'' کس کا انشائیہ ہے؟

جواب: ا۔ کنہیالال کپور ۲۔ میر حسن ۳۔ محمد حسین آزاد

۷۳۔ مثنوی ''سحر البیان'' میں کس تہذیب کی عکاسی ہے؟

جواب: ا۔ خالص ہندوستانی ۲۔ ایرانی ۳۔ عربی

۷۴۔ بے نظیر کس مثنوی کا کردار ہے؟

جواب: ا۔ سحر البیان ۲۔ گھر کا حال ۳۔ گلزارِ نسیم

۷۵۔ مثنوی ''سحر البیان'' کا سب سے متحرک کردار کون سا ہے۔؟

جواب: ا۔ نجم النسا ۲۔ بے نظیر ۳۔ بکاولی

۷۶۔ ''مغلوں نے ہندوستان کو تین چیزیں دیں۔ تاج محل، اردو، اور غالبؔ۔۔'' یہ کس کا قول ہے؟

جواب: ا۔ رشید احمد صدیقی ۲۔ میر حسن ۳۔ محمد حسین آزاد

۷۷۔ خدائے سخن کسے کہا جاتا ہے؟

جواب: ا۔ میرؔ ۲۔ میر حسن ۳۔ آتش

۷۸۔ کن شاعروں کے عہد کو اردو شاعری کا عہدِ زریں قرار دیا جاتا ہے؟

جواب: ا۔ میر و سودا ۲۔ میر و آزاد ۳۔ میر و آتش

۷۹۔ وہ تحریر جس میں کسی اہم یا غیر اہم واقعہ یا خیال کو پُر لطف انداز میں پیش کیا جائے۔ کیا کہلاتی ہے؟

جواب: ا۔ انشائیہ ۲۔ خاکہ ۳۔ افسانہ

۸۰۔ فیض کی نظم ''تنہائی'' کی پیروڈی کس نے کی؟

جواب: ا۔ کنہیالال کپور ۲۔ ساحر ۳۔ محمد حسین آزاد

۸۱۔ ''سخن دان فارس، دراکبری اور فلسفۂ الہیات'' کس کی تصانیف ہیں

جواب: ا۔ محمد حسین آزاد ۲۔ میر حسن ۳۔ سرسید

۸۲۔ ''قصص ہند اور رسوم ہند'' کس کی کتابیں ہیں؟

جواب: ا۔ محمد حسین آزاد ۲۔ رشید احمد صدیقی ۳۔ میر حسن

۸۳۔ مولانا محمد حسین آزاد کو ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جبلی تقریب پر کون سا خطاب ملا؟

جواب: ا۔ شمس العلماء ۲۔ مولانا ۳۔ نجم الدولہ

۸۴۔ رزم و بزم اور حسن و عشق کی داستانیں بیان کرنے کے لئے کون سی صنف مخصوص ہے؟

جواب: ا۔ مثنوی ۲۔ قصیدہ ۳۔ واسوخت

۸۵۔ نیچرل شاعری کے موجد کون ہیں؟

جواب: ا۔ محمد حسین آزاد ۲۔ رشید احمد صدیقی ۳۔ میر حسن

۸۶۔ تذکرہ ''نکات الشعراء'' کس نے لکھا ہے؟

جواب: ا۔ میر تقی میر ۲۔ حالی ۳۔ مصحفی

۸۷۔ عزیز النساء بیگم کس کی والدہ کا نام ہے؟

جواب: ا۔ سرسید ۲۔ رشید احمد صدیقی ۳۔ میر تقی میر

۸۸۔ ''آقائے اردو'' کس انشاء پرداز کو کہا جاتا ہے؟

جواب: ا۔ محمد حسین آزاد ۲۔ کنہیالال ۳۔ میر حسن

۸۹۔ ''کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے'' کس کا مصرع ہے؟

جواب: ا۔ دیا شنکر نسیم ۲۔ رشید احمد صدیقی ۳۔ میر حسن

۹۰۔ کس ادیب کا انتقال 'نیویارک'' میں ہوا؟

جواب: ا۔ پطرس ۲۔ فیض ۳۔ رشید احمد صدیقی

۹۱۔ 'ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔۔۔'' کس کا ماننا ہے؟

جواب: ا۔ رشید احمد صدیقی ۲۔ میر تقی میرؔ ۳۔ حالی

۹۲۔ ''میر تقی میر اردو کے شیخ سعدی ہیں۔۔۔'' کس کا ماننا ہے؟

جواب: ا۔ رام بابو سکسینہ ۲۔ سرسید ۳۔ جمیل جالبی

۹۳۔ یہ کس کے الفاظ ہیں؟ ''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔۔''

جواب: ا۔ سرسید ۲۔ حالی ۳۔ فراق

۹۴۔ ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔'' یہ کس کے الفاظ ہیں؟

جواب: ا۔ محمد حسین آزاد ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ کنہیالال کپور

۹۵۔ ''قیامت کے روز خدا مجھ سے سوال کرے گا کہ دنیا سے کیا لائے ہو تو میں یہی کہوں گا کہ حالیؔ سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں۔'' کس نے کہا ہے؟

جواب: ا۔ سرسید احمد خان ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ میر حسن

۹۶۔ مرزا شوق، دیا شنکر نسیم، رند اور خلیل کس شاعر کے شاگرد ہیں؟

جواب: ا۔ حیدر علی آتش ۲۔ محمد حسین آزاد ۳۔ میر تقی میر

۹۷۔ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کیسی مثنوی ہے؟

جواب: ا۔ عشقیہ ۲۔ رزمیہ ۳۔ المیہ

۹۸۔ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کس بحر میں ہے؟

جواب: ا۔ بحر متقارب ۲۔ بحر مثمن ۳۔ بحر ہزل

نوٹ: **تمام معروضی سوالات کا جواب (ا) ہے۔**

☆☆☆

STUDY OF MASNAVI & INSHAIYA

Course Contributors :
Dr. Liaqat Jaffari

Content Editing :
Dr. Parshotam Paul Singh

© Centre for Distance & Online Education, University of Jammu, 2025

- All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the CDOE, University of Jammu.
- The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the CDOE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed at : Pathania Printers / 2025 / Qty. 50

CENTRE FOR DISTANCE & ONLINE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMMU

SELF LEARNING MATERIAL

B.A. SEMESTER IV

SUBJECT : URDU	**UNIT : I - V**
COURSE NO. : UR-401	**LESSON : 1 - 31**

DR. HINA S. ABROL
Course Coordinator

http:/www.distanceeducationju.in
Printed and Published on behalf of the Centre for Distance & Online Education, University of Jammu, Jammu by the Director, CDOE, University of Jammu, Jammu.